ISSN 0974-7346

اگست ۲۰۲۵ء

جلد ۲۱۲ — عدد ۸

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان میں	:	سالانہ ۴۰۰/روپے۔ فی شمارہ ۴۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۱۰۰۰/روپے
		ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۸۰۰/روپے میں دستیاب ہے۔
		ہندوستان میں لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰/روپے ہے۔
دیگر ممالک میں	:	سادہ ڈاک ۱۷۳۰/روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰/روپے

اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ای میل (ساری دنیا میں) ۴۰۰/روپے سالانہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔

بینک ٹرانسفر کر کے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC : PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

● زر تعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔ ● معارف کا زر تعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔ ● خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ ● معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ ● کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔رقم پیشگی آنی چاہئے۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کے تصنیفی اور نشریاتی کام میں مدد کے لیے اس اکاؤنٹ پر تعاون کریں:

بینک کا نام:Punjab National Bank
اکاؤنٹ نمبر:4761005500000051
آئی ایف ایس سی:PUNB0476100
تعاون بھیجنے کے بعد تفصیلات سے ہم کو اس ایمیل پر مطلع کریں:
info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی CSR کے تحت رجسٹرڈ ہے۔اب بڑی تجارتی کمپنیاں براہ راست دارالمصنّفین کو CSR کے تحت عطیات دے سکتی ہیں۔

نوٹ: غیر ممالک سے تعاون بھیجنے کے لیے بینک کی تفصیلات ایمیل بھیج کر حاصل کریں۔

Ma'arif Section: 06386324437

Email: info@shibliacademy.org website: www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

عدد ۸	ماہ صفر المظفر ۱۴۴۷ھ مطابق ماہ اگست ۲۰۲۵ء	جلد نمبر ۲۱۲

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

شذرات	محمد عمیر الصدیق ندوی	۲
مقالات		
حافظ مولوی محمد نورالحسن کاندھلوی سرسید کے ایک معاون اور استاذ	ڈاکٹر ابوذر متین	۵
تعلیم اور مولانا مناظر احسن گیلانی	ڈاکٹر محمد ارشد	۱۸
شاہ ولی اللہ کا رسالۂ دانشمندی	ارشد علی ندوی	۲۵
شیخ نورالدین : کشمیری ثقافت کی تجدید اور اس کے وسیع اثرات	اشتیاق احمد وگے	۳۷
اسلامی دینار کی ولادت	محمد سنا جلہ	۵۲
اخبار علمیہ	ظ۔ا۔خ، ک۔ص۔اصلاحی	۵۶
وفیات		
مولانا عزیز الحسن صدیقی مرحوم	محمد عمیر الصدیق ندوی	۵۹
باب التقریظ والانتقاد		
دولت عثمانیہ اور ترکی کی تاریخ	محمد عمیر الصدیق ندوی	۶۲
تبصرۂ کتب	ع۔ص، ک۔ص۔اصلاحی، ف۔اصلاحی	۶۸
ادبیات		
بیاد مدینہ	ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی	۷۹
رسید کتب موصولہ		۸۰

شذرات

حالات، وقت کی پیداوار سمجھے جاتے ہیں۔ سال، مہینے، دن یہ سب وقت کے حیرت کدے کے آئینے ہیں، جن کے ذریعہ تاریخ، ماضی، حال اور مستقبل کی گردش و گردان سے انسانوں کو زندہ رہنے کے گر اور زندگی کے معانی سمجھاتی جاتی ہے۔ اگست کا یہ عیسوی مہینہ بھی ہر سال کچھ نہ کچھ یاد دلانے کا فرض نبھاتا ہے۔ اسی مہینے میں ملک و قوم کو مروجہ اصطلاح میں آزادی حاصل ہوئی تھی۔ آزادی کا تصور، غلامی کے تمام آزار کے راز کھولنے والا تھا۔ عزت نفس، رائے اور فکر کی آزادی، فہم و تدبر کی آزادی، خودی اور خود اعتمادی کے اظہار کی آزادی اور ملک کی بہبود و ترقی کے امکانات کو تلاش کرنے کی آزادی اور سب سے بڑھ کر جینے اور جینے دینے کے آداب کی آزادی، ایک دوسرے کی رفاقت اور قوم و ملک کی زندگی کے ہر شعبے میں مساوات عمل کی آزادی۔ آزادی کا یہی مفہوم، لال قلعہ پر لہراتے ہوئے ہندوستانی عَلم کے ذریعہ جب عام کیا گیا تو سیاست اور ذاتی اغراض و مقاصد سے مسموم فضا ہونے اور ذہنوں کی تقسیم کے، زمینوں کی تقسیم میں بدلنے کے باوجود آزادی کے مثبت معانی پر یقین کرنے کی وجہیں بہرحال توانا اور مستحکم تھیں۔ لیکن یہ وقت کی عملداری تھی کہ پندرہ اگست کی یادوں نے برسوں کے لحاظ سے پچاس کی باری آتے آتے دلوں میں یہ احساس اور زبانوں پر یہ شکوہ لا دیا کہ "نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی ملک کے ایک بڑے طبقے کی آرزوئیں بر نہ آئیں، وہ ہر لحاظ سے کم تر اور پس ماندہ اور دوسرے درجہ کی رعایا میں بدل گیا۔ جو دیکھا اور سنا تھا وہ تو بس خواب تھا۔" احساس کی یہ تلخی اب سے قریب پینتیس سال پہلے کے شذرات معارف سے کشید کی گئی۔ اس وقت کس کو اندازہ تھا کہ بیس تیس برسوں کے بعد یہ تلخی، نفرت، انتقام اور تعصب کے ایسے زہر میں بدل جائے گی جس کا مداوا صرف وقت ہی کے ہاتھوں میں ہوگا۔ آج صرف ایک بڑا طبقہ ہی نہیں، ملک کے خدا جانے کتنے طبقات ہیں جن کی امیدیں صرف وقت اور زماں کے الٹ پھیر کی عادت پڑ ٹکی ہوئی ہیں۔

***

آزادی کے لیے جسم و جاں اور عزت و آبرو سب قربان کر دینے والوں اور آزاد ہندوستان میں ہر ہندوستانی کے لیے تمام انسانی حقوق کی ضمانت دینے والوں نے شاید ہی سوچا ہو کہ صدیوں سے

اپنے وطن کی مٹی سے وجود میں آنے والوں اور پھر اسی مٹی کا حصہ بن جانے والوں سے ان کے ان کی وطنیت کا بار بار ثبوت مانگا جائے گا۔ اگر یہ عمل انتخابی اصلاحات کو بہتر طریقے سے نافذ کرنے کی نیت سے ہوتا تو شاید یہ موضوع بحث ہی نہیں بنتا لیکن جب یہ عمل ایک ہی طبقے، برادری یا خاص مذہبی شناخت والوں پر مرکوز ہو تو بعض سیاسی جماعتوں اور دانشور طبقوں کی تشویش اور یہ اندیشہ کہ اس عمل کے ذریعہ جمہوریت کا قتل کیا جارہا ہے۔ مسئلہ کی سنگینی اور اس کے دور رس، ضرر رساں بلکہ تباہ کن نتائج پر سنجیدگی سے غور کرنے پر زور دیتا ہے۔

***

ملک کی آزادی کے بعد مسائل، مصائب اور اندیشوں اور خدشوں کی کمی نہیں رہی، لیکن آئین ہند، جمہوری اقدار اور حزب اقتدار اور حزب اختلاف کے مابین سیاسی تہذیب اور کردار کا پاس ولحاظ اس طرح بے وزن اور بے وقار کبھی نہیں رہا۔ انسانی حقوق کے محافظ ادارے اگر بہت نیک نام نہیں رہے تو موجودہ روش کی طرح وہ بدنام بھی نہیں تھے۔ مگر اب یہ سچائیاں بذات خود سوال ہیں کہ ملک کی آزادی کا خواب کیا ان ہی تعبیروں کا مستحق تھا؟ یہ کیسی آزادی ملی جو ناکردہ گناہوں کی فہرست تیار کر کے بے گناہوں کو جیل کے عذابوں میں مبتلا کر دے اور جب وقت، جینے کی ہر امنگ کو بے جان کر دے تب عدل وانصاف کے آئینی فیصلوں کا اختیار رکھنے والوں پر برسوں بعد کھلے کہ الزامات کی بنیاد ہی نہیں۔

***

انصاف کی ایسی انوکھی مثال کی توقع کیا حریت اور آزادی کے لیے جان دینے والوں کے حاشیہ خیال میں بھی آئی ہوگی؟ قریب بیس سال تک قید و بند کی ہر اذیت اور ذلت برداشت کرنے کے بعد کیا صرف رہائی کا حکم، عدالت کے انصاف کے تقاضوں کو پورا کر جاتا ہے؟ ۲۰۰۶ء کے ممبئی میں ٹرین کے بم دھماکوں کے ملزمین کی رہائی کی خبر نے ایک بار پھر اس ملک میں آزادی کے مطالب ومقاصد پر غور کرنے کی ضرورت پر توجہ مرکوز کر دی اور وہ ہے اس ملک کی سب سے بڑی اقلیتی آبادی کے تئیں ایک مخصوص اور مسلسل منتقمانہ ذہنیت جو ملک کی آزادی اور اس کی سب سے بڑی دستاویز، آئین ہند کے درپے بنتی رہی۔

ممبئی ٹرین بم حادثے کے حالیہ فیصلے کے بارے میں اب ہندی اخبارات بھی کہنے لگے کہ ’’افسوس جب سبھی ملزم بری ہوگئے تب سوالوں کا انبار لگ گیا ہے؟‘‘سوال یہ بھی ہے کہ ۲۰۱۴ء کے بعد سے یہ چلن کیوں عام ہوا کہ نچلی اور ذیلی عدالتیں، جذبات میں آکر جلد بازی میں ایسے فیصلے کرنے لگیں جو بڑی عدالتوں میں غلط ثابت ہوئے۔ رونا صرف عدالتی مظالم کا نہیں ہے۔ حق رائے دہی ہو یا حق انصاف یا پھر درس گاہوں میں مسلمہ تاریخ کا حق تعلیم۔ ہر جگہ فسق و فساد اور جھوٹ اور تدلیس کا عالم بپا ہے۔ این سی ای آر ٹی کے نصاب میں تاریخی حقائق کو مسخ کر کے بابر کو بے رحم، اکبر کو سفاک اور اورنگ زیب کو ہندوکش ستم گر کی شکل میں پیش کر دیا گیا، سوشل سائنس میں ضروری سمجھا گیا کہ جزیہ کو عوامی رسوائی اور قبول اسلام کے لیے مالی اور سماجی ذریعہ ترغیب بتایا جائے۔ ذمہ داروں نے تحریف و تبدل کے اس فعل کے لیے وہی لہجہ اختیار کیا جو فسطائی ذہنیت کی جماعت کی پہچان ہے کہ ’’یہ واقعات ہوئے اور ہندوستانی تاریخ پر ایک نشان ثبت کر گئے، تاریخ کے یہ تاریک ادوار ہیں، جن کو بیان کرنا، تاریخ کو مسخ نہیں کرنا ہے‘‘، اس سوچ کے لیے کبھی ان کو ذمہ دار بتایا جاتا تھا جنھوں نے ہندوستان کو غلام بنا رکھا تھا۔ سب کے علم میں ہے کہ انگریزوں نے اسلامی ہند کی تاریخیں، سیاسی اغراض سے لکھیں۔ انھوں نے ہندوستانیوں کو غلامی میں مبتلا رہنے کے لیے، ہندو مسلم منافرت پھیلانے اور ہندوستان کے شاندار ماضی کی وقعت گھٹانے اور اپنے ظالمانہ اقتدار کی برتری کا نقش جمانے کے لیے ایسے واقعات تلاش کیے جن سے رائی بھی پہاڑ کی صورت اختیار کر لے۔ نیت صاف اور حقیقت شناس ہو تو چند بد نما واقعات کو قومی منافرت کا وسیلہ نہیں بنایا جاسکتا۔ ہمارے بزرگوں کی تاریخ نگاری میں یہی اصول پیش نظر رہا کہ آگے بڑھنے میں پچھلے واقعات پر نگاہ نہیں ڈالی جاتی۔ انگریزوں سے آزادی کے مفہوم میں دل و دماغ پر ان کے قبضے سے آزادی بھی شامل ہے۔ کاش ملک کا ذہن آزادی سے سوچتا کہ موجودہ حکمرانوں کی بے عنوانیاں، دراصل ان کی سرشت، ذاتی مصالح اور اقتدار کی سیاست کا نتیجہ ہیں، جن کو مذہبی، قومی، لسانی اور تاریخی تعصب کے ذریعہ نئی غلامی کی راہ ہموار کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر یہ سوچ زندہ ہوئی تو کہنے کا حق ہے کہ ملک کو آزادی کی سالگرہ مبارک ہو۔

***

مقالات

حافظ مولوی محمد نورالحسن کاندھلوی

سرسید کے ایک معاون اور استاذ

ڈاکٹر ابوذر متین

شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

drabuzaralig@gmail.com

متحدہ ہندوستان میں سرسید(۱۸۱۷-۱۸۹۸ء) کی شخصیت اور ان کی برپا کی ہوئی علمی اور اصلاحی تحریک کے بارے میں یہاں کے معروف اور غیر معروف علماء اور فضلاء نے موافقانہ اور مخالفانہ طور طریقوں اور رویوں کو روا رکھا تھا۔ ان رویوں میں ان کی جانب سے سرسید کی شخصیت اور کردار کی بیخ کنی کے ہر حربے استعمال کئے گئے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے اوپر کفر و الحاد کے بے جا الزامات اور ''نیچری'' جیسے اتہامات بھی لگائے گئے تھے۔ انہیں سب وشتم سے بھی نوازا گیا تھا۔ اس مضمون میں سرسید احمد خاں کے دور کے ایک ایسے صاحب مرتبت عالم اور فاضل ادب کا ذکر مقصود ہے جس نے بذات خود اور ان کی تین صاحب فضل و کمال اولاد اور پانچ دینی اور دنیاوی علوم کے حامل احفاد نے سرسید احمد خاں اور ان کی تحریک علی گڑھ کو اس کے ابتدائی دنوں ہی سے بھرپور تعاون کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان تمام باشعور حضرات نے اس تحریک کے لئے اپنی عظیم خدمات بھی پیش کی ہیں۔ ان سے ہماری مراد سرسید احمد خاں کے ایک ہم عصر حافظ مولوی حاجی محمد نورالحسن بن مولوی ابوالحسن بن مفتی الٰہی بخش کاندھلوی اور ان کی تین اولادیں اور پانچ احفاد ہیں۔ مولوی صاحب کا تعلق قصبہ کاندھلہ، ضلع مظفر نگر، یوپی کے ایک علمی، نامی گرامی خانوادے سے ہے جس کے نمایاں اثرات ان کی تمام آل و اولاد پر بھی پڑے ہیں۔ ان ہی کی طرح ان کی تمام اولاد حافظ، عالم اور فاضل ادب رہے ہیں۔ ان کا شیوہ اور طرۂ امتیاز اپنے والد گرامی کی طرح خدمت خلق اور اصلاح امت رہا ہے اور انہیں درس و تدریس، علم و ادب اور تحقیق و تصنیف سے بھی گہری مناسبت رہی ہے۔

سرسید احمد خاں انیسویں صدی عیسوی کے عظیم ترین مصلح قوم وملت رہے ہیں۔ ان کی شخصیت بے شمار خصائص اور امتیازات کی حامل رہی ہے۔ انہی خصوصیات اور امتیازات میں سے ایک اہم صفت ان کی یہ بھی رہی ہے کہ سرسید احمد خاں کے اپنے زمانے کے معروف علماء، فضلاء، ادباء اور اہل علم و دانش سے گوں ناگوں تعلقات اور مراسم رہے ہیں۔ ان ہی حضرات میں اس دور کے ایک عظیم خاندان کے بڑے عالم مولوی محمد نورالحسن (پیدائش ۲۶/ربیع الثانی ۱۲۲۷ھ وفات ۱۱/ محرم الحرام ۱۲۸۵ھ) کاندھلوی بھی ہیں۔

طرفین کے درمیان یہ تعلقات اور راہ ورسم کس طرح قائم ہوئے تھے، اس کے بارے میں حتمی اور یقینی بات بتانا مشکل ہے۔ مگر اس سلسلے میں کچھ ایسے اہم تاریخی حقائق اور دستاویزی ثبوت موجود ہیں جن سے طرفین کی ابتدائی اور بعد کی ملاقاتوں کا بخوبی ادراک ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان دونوں شخصیات نے دہلی میں مفتی صدرالدین آزردہ سے کسب فیض کیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ جن دنوں سرسید احمد خاں آگرہ شہر میں کمشنر ہملٹن کے یہاں فروری ۱۸۳۹ء تا دسمبر ۱۸۴۱ء بطورِ نائب منشی اپنی خدمات انجام دے رہے تھے، ان ہی دنوں مولوی نورالحسن صاحب آگرہ کالج میں عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے تدریسی خدمات پر مامور تھے۔ ابتدائی مراسم جو سرسید احمد خاں اور مولوی محمد نورالحسن کے درمیان دہلی میں دوران تعلیم قائم ہوئے تھے، ان دونوں کے بیک وقت آگرہ شہر میں مقیم ہونے کی وجہ سے ان کی رفاقت اور دوستی میں مزید استواری اور استحکام پیدا ہوتا چلا گیا۔ آگے چل کر یہ تعلق طرفین کے درمیان محبت واخلاص اور عزت واحترام میں اضافے کا باعث بنتا گیا ہے اور یہ اس حد تک ترقی اور پروان چڑھ گیا کہ سرسید احمد خاں نے مولوی نورالحسن صاحب کی ذات وصفات اور ان کے علمی وادبی فضائل وکمالات پر ”مولوی محمد نورالحسن“ کے زیرعنوان اپنی تاریخی کتاب ”آثار الصنادید“ میں ایک تذکرہ بھی شریک اشاعت کیا۔

مذکورہ تاریخی حقائق کے علاوہ یہ بھی ایک علمی حقیقت ہے کہ سرسید احمد خاں نے اپنے ایک مضمون ”غلط فہمی“ اور اپنی بعض دوسری اردو تحریروں میں مولوی محمد نورالحسن کو مولانا و مرشدنا جیسے القاب سے بھی یاد کیا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ طرفین کی دوستی کے نتیجے میں مولوی محمد نورالحسن کے چار صاحب زادوں میں سے تین براہِ راست سرسید احمد خاں اور ان کی علی گڑھ

تحریک کے خدمت گار اور معاونین میں رہے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی ساتھ مذکورہ حضرات کی پانچ اولادیں بھی سرسید احمد خاں کے قائم کردہ مدرسہ اور علی گڑھ کالج سے ابتدائی دنوں ہی سے بطور طالب علم وابستہ ہوئی ہیں۔

مولوی محمد نورالحسن کے چار صاحب زادوں میں تین صاحب زادے اپنے والد ماجد اور سرسید احمد خاں کی علم دوستی ہی کے نتیجے میں ان کی برپا کی ہوئی علی گڑھ تحریک سے ابتدائی دنوں ہی سے مختلف حیثیتوں سے وابستہ ہوئے اور اس تحریک کی آب یاری اور فیض رسانی کا کام انجام دیا۔ ان وابستگان اور خدمت گاروں میں مولوی محمد نورالحسن کے سب سے بڑے صاحب زادے مولوی محمد ضیاء الحسن عرف محمد صادق (۱۲۴۶ھ ۱۳۱۵-ھ)، تیسرے نمبر کے صاحبزادے مولوی محمد فیض الحسن عرف محمد اکبر (۱۲۵۳ھ ۱۳۰۳-ھ) اور سب سے چھوٹے فرزند مولوی محمد ریاض الحسن عرف محمد سلیمان (پ: ۱۲۵۷ھ) کے اسماء قابل ذکر ہیں۔ ان کی معاونت اور خدمات کا طریقۂ کار تحریک سرسید کے لئے مختلف النوع رہا ہے۔

مولوی محمد نورالحسن کے تیسرے نمبر کے صاحبزادے مولانا فیض الحسن عرف مولوی حافظ محمد اکبر کو سرسید نے مدرسہ اور کالج کے زمانے میں عربی اور سنی دینیات کی تعلیم و تعلم کے لئے اولین پروفیسر مقرر کیا اور ساتھ ہی ساتھ ان کو بورڈنگ ہاؤس کا اولین منتظم (موجودہ دور کا پراکٹر) اور کالج کی مختلف کمیٹیوں کا ممبر بھی بنایا۔ علی گڑھ کالج کی تدریسی اور انتظامی امور کی انجام دہی کے درمیان ان کی وفات ۸/ جولائی ۱۸۸۶ء کو ہوئی۔ اس موقع پر ایک تعزیتی تحریر بھی سرسید نے ان کے اوپر لکھا ہے[۱]۔ انہیں کے ساتھ ان کے داماد حافظ سعید احمد ساکن کاندھلہ کو سرسید نے ۱۸۸۳ء میں بورڈنگ ہاؤس کا نائب منیجر مقرر کیا[۲]۔

مولوی محمد اکبر صاحب کی وفات کے بعد سرسید احمد خاں نے مولوی محمد نورالحسن صاحب کے سب سے چھوٹے فرزند مولوی محمد ریاض الحسن عرف محمد سلیمان کو مولوی محمد اکبر کی جگہ بورڈنگ

---

[۱] مولوی محمد اکبر کے احوال و کوائف کے بارے میں دیکھئے: راقم الحروف کا مضمون "سرسید کے مدرسۃ العلوم اور کالج کے اولین عربی پروفیسر"، سہ ماہی "فکر و نظر" علی گڑھ، اکتوبر-دسمبر ۲۰۲۴ء، جلد ۶۱، شمارہ ۴، ص: ۲۱۰-۱۸۸۔

[۲] تفصیل کے لیے دیکھیں: ساجد نعیم (مرتبہ)، شناسان سرسید، جلد اول، ناشر: سرسید اکیڈمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۲۰۱۱، ص ۵۴-۵۳

ہاؤس کا مینیجر بنایا ہے[۳]۔

مولوی محمد نورالحسن کی مذکورہ تینوں اولاد کے ساتھ ہی ساتھ طرفین کی رفاقت اور دوستی کے نتیجے میں مولوی صاحب کے پانچ پوتے بحیثیت طالب علم سرسید کی تحریک علی گڑھ سے ابتدائی دنوں ہی سے وابستہ ہوگئے تھے۔ جن کی وجہ سے یہ سلسلہ مزید دراز اور خوب سے خوب تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ یہ سلسلہ سرسید احمد خاں کے ساتھ ان کے بیٹے سید محمود اور مولوی محمد نورالحسن کی اولاد اور ان کے پانچ پوتوں کے درمیان بھی قائم ہوگیا تھا۔ مولوی صاحب کے پوتوں میں ان کے تیسرے نمبر کے لڑکے مولوی محمد اکبر کے پسران حافظ مولوی بدرالحسن (۱۲۷۷ھ - ۱۳۴۰ھ)[۴] اور مولوی علاءالحسن (۱۲۸۸ھ ۱۳۴۱-ھ)[۵]؛ مولوی صاحب کے سب سے بڑے لڑکے مولوی محمد ضیاءالحسن کے پسر حافظ مولوی شمس الحسن (۱۸۶۳ء ۱۹۴۷-ء)[۶] اور مولوی صاحب کے دوسرے نمبر کے لڑکے مولوی حکیم محمد ظہورالحسن کے پسر حافظ مولوی عزیزالحسن (پ:۱۲۸۳ھ)[۷] اور مولوی صاحب کے پڑپوتے حافظ مولوی ظہیرالحسن بن مولوی محمد علاءالحسن اس عظیم کڑی کے حصے رہے ہیں[۸]۔ ان تمام کی ابتدائی دینی تعلیم وتربیت ان کے اپنے اپنے والدین اور دادا جان کے زیر سایہ ہوئی ہیں، مگر بعد میں ان کی عصری تعلیم وتربیت مدرسۃ العلوم اور علی گڑھ کالج میں ہوئی۔

علی گڑھ کے دوران تعلیم سرسید علیہ الرحمہ نے مولوی صاحب کے تمام پوتوں کے ساتھ شفقت پدرانہ سلوک فرمایا یہاں تک کہ مولوی محمد اکبر کی دونوں اولادوں مولوی بدرالحسن اور مولوی علاءالحسن کو کالج کے دوران تعلیم اسکالر شپ دلایا، انہیں گورنمنٹ کا وظیفہ یاب بھی بنوایا اور ان دونوں کو بالترتیب ۱۸۹۶ء ۱۸۹۷ء میں کالج کا ٹرسٹی بھی مقرر کیا۔ اسی کے ساتھ یہاں یہ بات

---

[۳] تفصیل کے لیے دیکھیں: مولانا محمد احتشام الحسن کاندھلوی، تذکرۂ اسلاف۔ حالات مشائخ کاندھلہ، ادارہ اشاعت دینیات حضرت نظام الدین دہلی، ۱۹۵۷ء، ص:۲۰۱

[۴] تفصیل کے لیے دیکھیں: تذکرہ حالات مشائخ کاندھلہ، ص:۱۹۵؛ نیز شناسان سرسید (جلد اول) ص:۱۶۵-۱۶۶

[۵] تفصیل کے لیے دیکھیں: تذکرۂ اسلاف حالات مشائخ کاندھلہ، ص۱۹۶؛ نیز شناسان سرسید جلد دوم ص:۲۷۳

[۶] تفصیل کے لیے دیکھیں: تذکرۂ اسلاف حالات مشائخ کاندھلہ، ص:۱۷۰؛ نیز شناسان سرسید (جلد اول) ص:۱۴۳

[۷] تفصیل کے لیے دیکھیں: تذکرۂ اسلاف حالات مشائخ کاندھلہ، ص: ۱۸۵؛ نیز شناسان سرسید جلد دوم ص: ۳۵۵

[۸] تفصیل کے لیے دیکھیں: تذکرۂ اسلاف حالات مشائخ کاندھلہ، ص:۱۹۷

بھی قابلِ ذکر ہے کہ سرسید احمد خاں کے صاحب زادے سید محمود نے بھی اپنے والد ماجد کی دوستی کے نتیجے میں مولوی محمد نورالحسن کی تمام اولاد، چار پوتوں اور ایک پڑپوتے کے ساتھ اپنی جانب سے ہم دردی اور الفت و یگانگت کا معاملہ روا رکھا۔

مولوی محمد نورالحسن اور سرسید احمد خاں کی رفاقت ہی کا نتیجہ تھا کہ راجہ جے کشن داس کی گود میں سرسید احمد خاں نے اپنے پوتے راس مسعود بن سید محمود کی دسمبر ۱۸۹۳ء میں تسمیہ خوانی مولوی نورالحسن کے بڑے صاحبزادے مولوی محمد ضیاء الحسن کے ذریعے انجام دلائی تھی۔ انہی دیرینہ تعلقات کا نتیجہ تھا کہ جب سرسید احمد خاں اپنے پنجاب کے سفر سے واپس ہو رہے تھے اور اپنے بعض رفقاء کی خواہش پر مظفر نگر میں قیام پذیر ہوئے تھے تو اس موقع پر مولوی صاحب کے بڑے صاحبزادے مولوی ضیاء الحسن نے سرسید احمد خاں کے اعزاز و اکرام میں منعقدہ ایک جلسۂ عام و خاص میں عربی زبان میں ایک تہنیت نامہ پیش کیا، تھا، جس میں انہوں نے کالج کے نظم و ضبط، درس و تدریس کے طور طریقوں کی تعریف و توصیف کی تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے سرسید احمد خاں کی برپا کی ہوئی وقف علی الاولاد کی تحریک میں ان کا تعاون کیا تھا اور اپنے بعض دوسرے معاصر علماء اور مفتیان کرام کی مخالفت کے باوجود سرسید احمد خاں کی آراء اور تجاویز کی تائید کی تھی اور ان کے حق میں بحیثیت قاضی شہر فتاوے بھی صادر فرمائے تھے[۹]۔ سرسید احمد خاں نے انہیں بھی ۱۵ جنوری ۱۸۹۷ء کو ایم-او-کالج کا ٹرسٹی مقرر کیا تھا[۱۰]۔

عربی سپاس نامے کو مولوی محمد نور الحسن صاحب کے سب سے بڑے صاحبزادے مولوی محمد ضیاءالحسن نے سرسید احمد خاں کی مظفر نگر آمد کے موقع پر ۷ فروری ۱۸۸۴ء کو پیش کیا تھا[۱۱]۔ اس سپاسنامے میں انہوں نے کہا: ”مسلمانوں کی جماعت (مظفر نگر کے اعیان و عمائدین) دل کی گہرائیوں سے اس عظیم شریف نیک انسان کا شکریہ ادا کرتی ہے جسے سید احمد کے نام سے جانا جاتا ہے۔ قادر مطلق انہیں نفرت اور کدورت کے عذاب سے محفوظ رکھے۔ یہ جماعت اپنے اس

---

[۹] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۷ جنوری، ۱۸۸۰ء، جلد: ۱۵، شمارہ: ۵، ص: ۶۲-۶۱

[۱۰] تفصیل کے لیے دیکھیں: تذکرۂ اسلاف حالات مشائخ کاندھلہ، ص: ۱۶۷، نیز شناسان سرسید جلد دوم، ص: ۱۹۶

[۱۱] مولوی سید اقبال علی، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، سید احمد خاں کا سفر نامہ پنجاب، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع دوم اپریل ۱۹۹۱ء، ص: ۳۸۴-۳۸۳

محسن اور منعم کا شکر گزار کیوں نہ ہو جو دین اور مسلمانوں کی سربلندی کی خاطر اپنی توانائی صرف کرتا ہے اور جس کے عوض وہ لوگوں کی طعن و تشنیع برداشت کرتا ہے اور وہ کسی ملامت گر کی ملامت سے ڈرتا نہیں ہے۔ ایسے سنگین حالات میں اگر وہ قوم کی اصلاح کی طرف توجہ نہ دیتے تو قوم ہلاک ہو جاتی، اس کا بیڑا غرق ہو جاتا اور اس ہلاکت خیزی سے کبھی بھی قوم نجات نہیں پا سکتی۔ یہ کام ایسا نہیں ہے کہ اس پر ان کے ان مخالفین اعتراض کریں جن پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد صادق آرہا ہے کہ تم لوگ وہ باتیں کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں ہو، اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت ہی ناپسندیدہ بات ہے کہ تم لوگ وہ بات کہو جو تم لوگ خود نہیں کرتے۔ ان سطور کے لکھنے والے ناچیز کا نام ضیاء الحسن ہے، اللہ تعالیٰ اس کو آلام اور مصائب سے محفوظ رکھے۔ متعدد بار مسلمانوں کے مدرسے میں گیا اور کئی روز تک اس کی چہار دیواری میں مقیم رہا۔ اس نے وہاں کی درس و تدریس کے طور طریقوں کا مشاہدہ کیا، طلبہ اور ان کی تعلیم و تربیت کے طریقوں کو قریب سے دیکھا۔ اس نے طلبہ کو تعلیمی اوقات میں تعلیم کے حصول کے وقت دنیا کے کسی دوسرے کام یا کھیل کود میں مصروف نہیں دیکھا۔ یہ ان کے اساتذہ کرام اور ان کے نگراں کے حسن انتظام کی دلیل ہے۔ ان خصوصیات کو دیکھنے کے بعد میرے ذہن میں ایک سوال آیا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ لوگ طلبہ کو برا بھلا کہتے ہیں اور مدرسہ کے منتظمین کی طعن و تشنیع کرتے ہیں۔ جب میں نے قوم کی ناراضگی کی وجوہات پر غور کیا تو میں نے محسوس کیا کہ اس کی بنیادی وجہ طلبہ کے ڈریس میں تبدیلی ہے۔ لہذا سید مکرم اور محترم نگراں سے میری استدعا اور گذارش ہے کہ طلبہ دوران تعلیم جو ڈریس پہنتے ہیں اس میں تبدیلی کی جائے اور ان کے مروجہ ڈریس کو حکام اور گورنر کی مجالس میں شرکت کے لئے مخصوص کیا جائے اور عام اوقات میں اس کے استعمال پر روک لگائی جائے۔ جس طرح محترم المقام اپنی توجہ دنیاوی امور کی اصلاح پر مبذول کئے ہیں، اسی طرح انہیں اپنی توجہ طلبہ کی اخروی زندگی پر بھی مبذول کرنی چاہئے تاکہ قوم کے سارے افراد پوری تندہی سے مدرسے کی طرف مائل ہوں۔ میں اپنی بات کا اختتام اس دعاء پر کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مدرسہ اور اس کے منتظمین کو تا قیامت بقاء اور دوام نصیب فرمائیں"۔

اس سپاس نامے میں مولوی محمد ضیاء الحسن نے کالج کے طلبہ کے ڈریس کوڈ کے بارے میں جو اعتراضات کئے تھے ان کا تفصیلی جواب سرسید نے اسی موقع پر اپنی جوابی تقریر میں دیا۔ سرسید نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ مولوی ضیاء الحسن کے خاندان سے ہماری قربت ہے۔ ہم ان کے اور ان

کے خاندان کے ذی علم حضرات سے بھلی بھانت واقف ہیں۔ مزید کہا کہ صاحب سپاس نامہ نے مدرسۃ العلوم اور کالج کا بچشم خود مشاہدہ کیا ہے۔ اس دوران انہوں نے بورڈنگ ہاؤس کے طلبہ کے ڈریس کے علاوہ کوئی کمی نہیں دیکھی ہے۔ سرسید نے اپنی اسی جوابی تقریر میں اسلام میں لباس کی حیثیت اور اہمیت بیان کی ہے اور اس کی حقیقی اور تاریخی وقعت پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی اور فرمایا کہ اسلام اپنے ماننے والوں سے مخصوص ڈریس کوڈ کے بجائے ایسے لباس کے استعمال کی تلقین کرتا ہے جس سے انسانوں کی حفاظت اور ستر پوشی مقصود اور مطلوب ہوتی ہے[۱۲]۔

طرفین کے قلبی تعلقات کی ایک عظیم کڑی مولوی محمد اکبر بن مولوی محمد نورالحسن کی تھی جو مدرسۃ العلوم اور علی گڑھ کالج کے پہلے عربی زبان کے استاذ اور پروفیسر تھے۔ ان کے انتقال پر سرسید احمد خاں نے ایک تعزیتی تحریر بطور خراج عقیدت لکھی جس میں انہوں نے اپنے رنج وکرب کو بیان کیا اور مدرسہ اور کالج میں ان کی تقرری، خدمات، ذات وصفات اور ان کے احوال وکوائف بیان کیے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے آباء واجداد کے علم وفضل اور اوصاف وکمالات کو بھی درج کیا۔ اس سے جہاں ان بزرگوں کے حالات زندگی اور کارناموں سے واقفیت حاصل ہوتی ہے، وہیں اس تعزیتی تحریر سے سرسید احمد خاں سے ان کے خاندانی تعلقات کا بھی علم ہوتا ہے۔

حافظ مولوی محمد نورالحسن (پیدائش ۲۶ ربیع الثانی ۱۲۲۷ھ وفات ۱۱ محرم الحرام ۱۲۸۵ھ) کا تعلق قصبہ کاندھلہ ضلع مظفر نگر کے ایک معروف ومشہور علمی، دینی، اصلاحی اور دعوتی خانوادے سے ہے جس میں موجودہ دور سے لے کر سابقہ ادوار میں علماء، فضلاء، ادباء، فقہاء، حکماء، مجاہدین اور داعیان اسلام پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد مولوی ابوالحسن (متوفی ۲۱ جمادی الاول ۱۲۶۹ھ مطابق ۲ مارچ ۱۸۵۳ء) کمالات ظاہری اور باطنی کے ساتھ میدان طب کے بھی ماہر تھے۔ عابد اور متقی تھے، علم عروض وقوافی پر قدرت کاملہ رکھتے تھے، علم فرائض پر بھی انہیں دسترس تھی۔ انہیں فتاویٰ نویسی سے بھی گہری مناسبت تھی۔ شعر وسخن کا طبعی ذوق وشوق ورثہ میں ملا تھا۔ متعدد فارسی اور اردو قصیدے اور مثنویاں انہوں نے بطور یادگار چھوڑی ہیں۔ جن میں کتاب ”بحرالحقیقت“ کا منظوم اردو ترجمہ مقبول اور معروف زمانہ ہے۔ مثنوی مولانا روم دفتر اول منظوم

---

[۱۲] تفصیل کے لئے دیکھیں: سید احمد کا سفر نامہ پنجاب، ص: ۳۹۶-۳۸۸

اردو ترجمہ بھی آپ کی علمی وادبی صلاحیت کے مظاہر میں شامل ہے۔

مولوی نور الحسن صاحب کے دادا مفتی الٰہی بخش (۱۱۶۲ھ - ۱۲۴۵ھ) بن شیخ الاسلام بن مولوی قطب الدین، حضرت شاہ عبد العزیز محدث دھلوی کے شاگرد رشید رہے ہیں۔ آپ کا شمار بلند پایہ عالم اور مصنفین میں ہوتا ہے۔ عربی، فارسی اور اردو ان تینوں ہی زبانوں کے علوم وآداب پر علمی وادبی تصانیف اور نگارشات عالیہ آپ کی ذات بابرکت سے وابستہ ہیں۔ علمی وادبی کاموں کے علاوہ آپ اپنے دور کے معروف زمانہ استاذ اور مفتیان عظام میں شمار کیے گئے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام، علم اخلاق و تصوف، علم معانی، بیان و بدیع، علم عروض و قوافی، علم منطق و فلسفہ اور علم طب و حکمت پر آپ کی گراں قدر تصنیفی خدمات رہی ہیں۔ مولانا رومی کی مثنوی دفتر ہفتم کی تکمیل و تصنیف آپ کی فارسی شاعری پر دست قدرت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ عربی قصیدہ بانت سعاد کا فارسی، اردو اور عربی میں ترجمہ اور تشریح بھی آپ کی قدرت کاملہ کا ثبوت ہیں۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں ایک عربی قصیدہ بھی آپ کی ذات گرامی سے منسوب ہے۔ ان علمی وادبی کارناموں کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو زبان میں بہت سی تصانیف، چھوٹے اور بڑے علمی رسالے اور درسی کتب پر حاشیہ آرائی بھی آپ کی علمیت کی غمازی کرتے ہیں۔

مولانا محمد احتشام الحسن کاندھلوی نے اپنی کتاب "تذکرۂ اسلاف - حالات مشائخ کاندھلہ" میں مذکورہ خانوادے کی ابتدائی اور بعد کے ادوار کی مختلف مقتدر شخصیات کے ساتھ مولوی محمد نورالحسن اور ان کی اولاد اور ان کے بعض دوسرے معاصر بزرگوں اور مشائخ کے حالات زندگی اور ان کے علمی، ادبی، سماجی اور اصلاحی کارناموں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کتاب کا تعارف مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا تحریر کردہ ہے۔ وہ اپنے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> ہندوستان کے ان چیدہ وبرگزیدہ خاندانوں میں جو صدیوں تک علم و فضل اور ذہانت و ذکاوت کے گہوارہ رہے ہیں، صدیقیوں کا ایک وہ خاندان بھی ہے جس کا اصل وطن جھنجھانہ ضلع مظفر نگر اور وطن ثانی کاندھلہ ضلع مظفر نگر ہے۔ یہ گھرانہ ان خوش قسمت خاندانوں میں سے ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے قبولیت وعنایت سے نوازا۔ اس خاندان کی بنیاد کچھ ایسے صدق واخلاص پر پڑی تھی کہ صدیوں تک یکے بعد دیگرے اس میں علماء فضلاء و اہل کمال اور مقبولین پیدا ہوتے رہے۔ علو استعداد و علو ہمت اس کی خاندانی خصوصیت ہے اور انہیں دو چیزوں نے اس

خاندان کو ایسا شرف و امتیاز عطا کیا کہ ہر دور میں اس میں باکمال اور اکابر رجال پیدا ہوتے رہے۔ علو استعداد و علو ہمت نے اس خاندان کے افراد میں علمی جامعیت اور تبحر کی شان پیدا کی اور انہوں نے اپنے اپنے وقت میں مروجہ علوم اور اکثر اصناف کمال کی طرف توجہ کی اور ان میں دستگاہ پیدا کی۔ اس کی وجہ سے اس میں بلند پایہ فقیہ و مفتی جامع معقول و منقول عالم، قادر الکلام شاعر اور حاذق طبیب پیدا ہوئے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اور ان کے خاندان کے تلمذ نے اتباع سنت، اصلاح عقائد و اعمال کا ذوق اور اشاعت علم کا جذبہ پیدا کیا۔ حضرت سید احمد شہید سے تعلق نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا اور توحید و اتباع سنت کے ساتھ جذبۂ جہاد و سرفروشی کا اضافہ کیا۔ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی کے یگانہ روزگار ورع و تقوی نے اور ان کی بلند ہمتی و جفاکشی مردوں کے ماسوا بیبیوں اور بچیوں میں بھی احتیاط و تورع اور ذکر و عبادت کا ذوق پیدا کر دیا۔ پھر اس خاندان کی بڑی خصوصیت یہ رہی کہ اس نے اپنے موروثی فضل و کمال اور سلسلۂ روحانی کے باوجود اپنے اپنے زمانے کے مقبول مشائخ اور خاصان خدا سے جو اپنے فن کے امام اور اپنے زمانہ میں مرجع خلائق تھے استفادہ و انتساب میں تامل نہیں کیا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ، حضرت سید احمد شہید کے بعد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری، حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری اور دوسرے معاصر بزرگوں سے اس خاندان کے اہل کمال اور اہل طلب برابر منسلک اور وابستہ ہوتے رہے اور یہ سلسلہ بحمد اللہ اب تک جاری ہے اور یہ اس کے صدق طلب و علو ہمتی کی دلیل ہے۔ اس خاندان کی قبولیت اور اس پر اللہ تبارک و تعالی کی جو نگاہ عنایت ہے اس کی کھلی ہوئی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے اس دور میں اس خاندان سے دعوت و اصلاح کا وہ عظیم الشان کام لیا جس کی نظیر اس وقت عالم اسلام میں ملنی مشکل ہے، مشہور تبلیغی دعوت و تحریک کا یہی خاندان سرچشمہ و منبع ہے۔ اسی خاندان میں حضرت مولانا محمد الیاسؒ جیسی شخصیت پیدا ہوئی جس سے اللہ تعالیٰ نے اس دور میں تجدیدی شان کی خدمت لی اور جن کے اخلاص، علو ہمت، علو نظر، مجاہدہ اور قربانیوں کے اثرات و برکات، فیوض و ثمرات اس وقت دنیا کے ایک بڑے حصے میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کے بعد ان کے خلف الرشید مولانا محمد یوسف صاحب اس کی توسیع و تکمیل میں مشغول ہیں۔ ان کا صدق و اخلاص، ان کا توکل و اعتماد، ان کی صحبت کی تاثیر، ان کا جذبۂ جوش اور ان کا مجاہدہ اور جدوجہد مشاہدہ کی حیثیت رکھتی ہے جس کے لیے کسی دلیل کی

ضرورت نہیں کہ عیاں راچہ بیاں۔ اسی طرح حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم کی ذات گرامی اسلاف اور ان کے کمالات کی زندہ یادگار اور اپنے خاندان کے علو ہمت مجاہدہ و جامعیت اور اخلاق کی ایک جیتی جاگتی تصویر اور دور ماضی کے واقعات کی تصدیق ہے[۱۳]۔

مولوی محمد نورالحسن مذکورہ بالا علمی، دینی، اصلاحی اور اہل کمال اشخاص و افراد خاندان کے ایک ایسے عالم و فاضل ہیں جن کو اپنے آباءواجداد سے علم و فضل وافر مقدار میں نصیب ہوا۔ ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت ان کے اپنے والد ماجد مولوی ابوالحسن اور ان کے اپنے داداجان مفتی الٰہی بخش کے زیر نگرانی انجام پذیر ہوئی۔ مزید تعلیم کی حصول یابی کے لئے ۱۲۴۷ھ میں انہوں نے دہلی کا سفر کیا اور شاہ محمد اسحٰق محدث دہلوی، مولانا فضل حق خیرابادی اور مفتی صدرالدین آزردہ (جو سرسید احمد خاں اور مولوی سمیع اللہ خاں کے بھی استاذ تھے) کسب فیض کیا۔ مفتی صدرالدین آزردہ اور مولانا فضل حق خیرابادی سے جو تعلق خاطر رہا ہے، اس کا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے جو ان صاحبان نے مولوی نورالحسن کو اس زمانے میں تحریر کئے۔ ان کی علمی کاوشوں میں فقہ حنفی کی معروف زمانہ کتاب "ہدایہ اولین" کی حاشیہ نگاری ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے عباسی دور کے معروف عربی شاعر متنبی کے دیوان پر مختصر اور نہایت جامع حاشیہ بھی تحریر کیا ہے۔ ریاست الور کے اپنے دوران قیام انہوں نے وہاں کے حالات اور کیفیات کو بھی ایک رسالے کی شکل میں تحریر کیا ہے، جس کی دیگر خصوصیات کے علاوہ ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ رسالہ عربی زبان میں ہے اور غیر منقوط ہے۔ ان تمام مذکورہ بالا علمی کارناموں کے علاوہ مولانا محمد احتشام الحسن کاندھلوی کے بقول: شاہ محمد اسحٰق محدث دہلوی کی کتاب "مائۃ مسائل" دراصل مولوی محمد نور الحسن صاحب ہی کی تصنیف ہے۔ ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۱ء کے سال میں حج بیت اللہ اور مدینہ منورہ کی زیارت سے انہیں شرف یابی نصیب ہوئی۔

تعلیمی سلسلے کی تکمیل کے بعد مولوی محمد نورالحسن خاندانی عزو وقار اور ظاہری وجاہت وثروت کی وجہ سے ۴ جنوری ۱۸۴۶ء کو دیوبند ضلع سہارن پور کی عارضی نائب تحصیل داری تفویض کی گئی۔

---

[۱۳] تذکرۂ اسلاف۔ حالات مشائخ کاندھلہ، ادارہ اشاعت دینیات حضرت نظام الدین نئی دہلی، ۱۹۵۷ء، ص: ۶-۵

اس کے بعد ایک لمبی مدت تک آپ نکوڑ ضلع سہارن پور میں تحصیل دار رہے۔ اس کے بعد ریاست الور کے راجہ کی طلبی پر ان کے یہاں تشریف لے گئے اور بہت ہی عزو وقار کے ساتھ ریاستی امور کو بحسن و خوبی انجام دیا۔ اس کے بعد ریاست سے قطع تعلق ہو کر آگرہ کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوگئے۔ بعض وجوہ کی بناء پر آگرہ کالج میں بھی مولانا نور الحسن صاحب زیادہ مدت قیام نہ کر سکے اور وہاں کی پروفیسر شپ کو خیر باد کہہ ڈالا۔ اس کے بعد اپنے وطن کاندھلہ تشریف لے گئے اور درس و تدریس میں پورے ذوق اور انہماک کے ساتھ مشغول ہوگئے۔ مولانا محمد احتشام الحسن کاندھلوی مرحوم نے اپنی کتاب ''تذکرۂ اسلاف -حالات مشائخ کاندھلہ'' میں تحریر کیا ہے کہ اس زمانے میں طلبہ کا قیام و طعام اوران کے بعض دیگر اخراجات مولانا نور الحسن خود برداشت کرتے تھے۔ طلبہ کے درمیان امیر و غریب کی کوئی تخصیص نہیں کرتے تھے یہاں تک کہ سال میں دو جوڑے کپڑے اور ایک لنگی انہیں مرحمت فرماتے تھے۔ طلبہ کی تعداد ۱۵ تا ۲۰ ہوتی تھی۔ ان کے معروف و مشہور شاگردوں میں ان کے چاروں صاحب زادے ہیں، جن میں سے تین کے اسماء سابقہ سطور میں آچکے ہیں۔ ایک نام جو باقی بچا ہے وہ مولوی حکیم محمد ظہور الحسن عرف محمد ابراہیم (پ: ۱۲۴۹ھ) کا ہے۔ ان طلبہ میں مولانا مملوک علی، مولانا عبد الحق خیر ابادی، مولانا احمد حسن مرادابادی اور مولانا سورتی بھی قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ طلبہ میں اگر سر سید احمد خاں کے نام کا اضافہ کرلیا جائے تو یہ فہرست یقینی طور پر بہت ہی جامع ہو جائے گی، جس کی نظیر اور ثبوت مولانا محمد احتشام الحسن کاندھلوی کی کتاب ''تذکرۂ اسلاف - حالات مشائخ کاندھلہ'' میں موجود ہے۔ مولانا اپنی مذکورہ کتاب میں مولوی محمد نور الحسن کے تذکرے میں ایک جگہ لکھتے ہیں: '' آپ نے ریاست کا تعلق قطع کرکے آگرہ کالج میں عربی کی پروفیسری اختیار کی۔ آگرہ کالج کے دوران قیام میں سر سید احمد خاں بانی علی گڑھ یونیورسٹی نے حضرت مولانا موصوف سے تعلیم حاصل کی، جس کو آخر تک انہوں نے اور ان کی اولاد نے بہت حسن و خوبی کے ساتھ نبھایا اور اس تعلق کو آخر تک قائم اور برقرار رکھا۔ سر سید احمد نے سیرت میں ایک اردو رسالہ لکھ کر حضرت مولانا نور الحسن کے پاس اصلاح کے لیے بھیجا جو میرے پاس موجود ہے اور سر سید کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے''[۱۴]۔

---

[۱۴] تذکرۂ اسلاف حالات مشائخ کاندھلہ ص: ۱۴۹-۱۴۸

مولانا محمد احتشام الحسن نے اپنی مذکورہ کتاب میں یہ بھی تحریر کیا ہے کہ مولانا نورالحسن کا ادبی ذوق اس قدر اعلیٰ تھا کہ ان کے اساتذہ تک ان کی قدردانی کرتے تھے۔ جب مولانا فضل حق خیرابادی کوئی قصیدہ کہتے تو اس کو نقل کرا کر مولانا نورالحسن کے پاس اصلاح کے لیے بھیجتے تھے۔ اسی طرح انہوں نے مولوی محمد نورالحسن کے تذکرے میں ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ بانئ مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی مہاجر مکی کا ایک خط مولانا کاندھلوی کے نام ہے۔ جس سے جانبین کے تعلقات اور ایک دوسرے کے کمالات پر روشنی پڑتی ہے۔

۱۸۵۷ء کی تحریک جہاد کے روح رواں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دھلوی کے خاندان کی مقدس ہستیاں تھیں۔ جن سے مولوی محمد نورالحسن کے خاندانی اور روحانی عقیدت اور علمی وارفتگی اور شیفتگی تھی۔ اہل علم جانتے ہیں کہ اس تحریک کو جلا بخشنے اور کامیاب بنانے کے لئے اس وقت علماء کے دو گروہ سرگرم عمل تھے۔ ایک گروہ خاندان ولی اللہ سے روحانی عقیدت کی وجہ سے اس جہاد میں شامل تھا، جس کے سربراہ شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، حضرت حافظ محمد ضامن شہید اور ان کے متوسلین اور منتسبین مثلاً مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی وغیرہ تھے۔ اس جماعت کی دوسری بہت بڑی خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس کی قرابت داری بھی شاہ صاحب کے خاندان سے قائم تھی۔ دوسرا گروہ جو حضرت شاہ صاحب کی آل واولاد سے صرف شاگردی کا تعلق رکھتا تھا، جس کے سربراہ مولانا فضل حق خیرابادی اور مفتی صدرالدین آزردہ تھے۔ مولوی نورالحسن ان دونوں علماء کرام کے شاگرد رشید رہے تھے۔ اس تحریک جہاد کو کامیابیوں سے ہم کنار کرنے کے لئے مولانا احمد اللہ شاہ نے دہلی پہنچ کر جو مجلس مشاورت منعقد کی تھی، اس کے شرکاء میں مولانا نورالحسن کا اسم گرامی درج ہے اور جب مفتی صدرالدین صاحب آگرہ منتقل ہونے کے بعد جو مجلس شوریٰ اپنے یہاں منعقد کی تھی، اس مجلس میں بھی مولوی نورالحسن شریک رہے ہیں۔ اسی طرح مولانا احمد اللہ شاہ نے اس تحریک جہاد کے لیے جو مجلس علماء قائم کی تھی، مولانا نورالحسن اس کے بھی رکن رہے ہیں۔

سرسید احمد خاں اپنی تاریخی کتاب ''آثار الصنادید'' میں مولوی نورالحسن کی شخصیت اور ان کے اوصاف وکمالات کے بارے میں رقم طراز ہیں:

فضائل پناہ، کمالات دستگاہ، رنگ چہرہ فضیلت، آب روئے شریعت، دقائق آگاہ، حقایق

ومعارف پناہ، خازن گنجینۂ اسرار ازل، جامع شرائف علم و عمل، ارسطو فطرت، فارابی فطنت، بانی مبانی فضل وافضال ومؤسس اساس تکمیل واکمال، قطب سمائے ہدایت وارشاد، منطقۂ فلک راسی وسداد، عضادۂ اصطرلاب دانش وحکم بہ نکتہ سنجی ہا معروف و بدقیقہ فہمی علم، مو شگاف دقائق علم وفن مولوی محمد نورالحسن، سلمہ اللہ تعالی، شاگرد رشید مولانا محمد فضل حق زادت فضیلتہ - کمالات علم اور فضائل خلق وعلم میں یگانۂ روزگار، حدت ذہن اور رسائی فہم میں یکتائے قرون وادوار، فاضل اجل سرگروہ فضلائے کمال، خلق جبلی سے بہین فرد و افراد امت محمدی اور سعادات ذاتی سے سرگروہ نزدیکان بارگاہ صمدی، اس جزو زمان میں معقول و منقول میں ایسی مہارت تامہ رکھتے تھے کہ اگر موجودگی معدوم اور جائز کے ناجائز ہونے کا دعوی کریں تو خصم کو بدلیل عقلی ونقلی دلنشین کر سکتے ہیں - وجود ایسے فرد کامل کا ایسے روزگار ناپرساں میں دلیل قدرت پروردگار ہے - کمالات ظاہری تو آپ کی ذات بابرکت میں جس طرح مجتمع ہیں وہ نہایت ظہور اور غایت وضوع سے احتیاج بیان کی نہیں رکھتے - جلائل باطنی اور شرائف معنی جس قدر ان کی طرف استعداد میں فراہم ہیں، اگر خامۂ دوزبان ان کے بیان میں سرگرم ہو تو ایک قرن تک چاہیے کہ سوااس ذکر کے اور کسی حرف کو زبان پر نہ لاوے، تو شاید اس کے ایک حرف کے بیان سے عہدہ برآ ہو سکے - سبحان اللہ خلق مجسم علم مصور، وقار مشکل، خلق ایسا کی بندگان الہی کی دل شکنی آپ کے اعتقاد میں خانہ خدا کی بنیاد کے گرانے سے کم جرم نہیں رکھتی اور علم ایسا کی اگر اس کو ایک جگہ فراہم لاکر فرق فلک نہم پر رکھ دیں تو بہ سبب گرانی بار کے طبقات کرات کو اس طرح توڑتا ہوا پستی کو مائل ہو اور محیط کے دوسری طرف سے گذر جانے کو اوج سے حضیض تک نگاہ کو ایک جادۂ مستقیم محسوس ہو اور وقار اس درجہ میں کہ فلک دوار کی ہزار گردشیں ان کی تمکین کی ایک نشست میں سرمو تفاوت پیدا نہیں کر سکتیں اور ان کمالات پر مزید ہے تقوی وساری وزہد شعاری۔ نقل کسی صحابی کی کہ وہ کہتے تھے: اگر مال تمام عالم کا مجھ کو دے کر چاہیں کہ ایک اذان نہ سنوں مجھ سے نہ ہو سکے گا، بے کم وکاست وبے اغراق مبالغہ ان کے حق میں صادق آتی ہے - بمقتضائے اس کے کہ بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم راقم آثم کے حال پر ان حضرت کی نگاہ توجہ کو اب معروف کر دیا ہے کہ بدرجہ غایت نظر تربیت استادانہ، اسے منظور فرماویں تاکہ شاید یہی نظر عنایت بارگاہ کریم میں اس احقر کی نجات کا سبب ہو جاوے - کوتاہ شب وفسانہ بسیار - زبان قلم قاصر ہے - کہاں تک کہے۔ اگر زمانہ مساعد ہو گا تو ایک دفتر علیحدہ ان سرگروہ کملائے دہر کے محامد میں لکھوں گا۔(۱۵)

---

(۱۵) سرسید احمد خاں، آثار الصنادید، مطبع سید الاخبار، ۱۸۴۷ء، ص:۱۲۶-۱۲۴؛ نیز اسماعیل پانی پتی (مرتب)، مقالات سرسید، مجلس ترقی ادب لاہور، نومبر ۱۹۶۵ء، جلد: ۱۶، ص:۳۴۶

شاہ ولی اللہ کا رسالۂ دانشمندی

ارشد علی ندوی
ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
arshadali35520@gmail.com

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان میں کتاب وسنت، اسلامی عقائد اور عربی وفارسی زبان وادب کے حوالے سے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ قابلِ فخر بھی ہیں اور لائقِ تحسین وستائش بھی۔ بعد کے دور میں برصغیر کی خاک سے اٹھنے والے تمام مفسرین، محدثین اور مصلحین اسی شجرۂ طوبیٰ کی شاخیں ہیں۔

شاہ صاحب کی ولادت چہار شنبہ کے دن ۴؍ شوال ۱۱۱۴ھ کو ان کے نانیہال قصبہ پھلت، ضلع مظفر نگر میں ہوئی[۱]۔ ان کی عمر جب پانچ سال کی ہوئی تو مکتب میں داخل کیے گئے۔ سات سال کی عمر میں قرآن مجید کے حفظ سے فراغت ہوئی۔ اس کے بعد فارسی اور عربی کی کتابیں پڑھنا شروع کیں[۲] اور چودہ سال کی عمر میں علوم متعارفہ سے فارغ التحصیل ہو گئے اور علم سلوک کا کافی حصہ بھی حاصل کر لیا، چنانچہ اس سال آپ کے والد بزرگوار حضرت شیخ عبد الرحیم صاحب نے آپ کے سر پر فضیلت کا عمامہ رکھا اور درس کی عام اجازت دی۔[۳]

شاہ صاحبؒ کو علمی ترقی کا خیال ہمیشہ رہتا تھا۔ آپ نے اجازت وسند حاصل کرنے کے بعد کتابوں کا مطالعہ شروع کیا اور نہایت سخت محنتیں کیں۔ آپ کتب بینی میں اس درجہ مستغرق ہو جاتے تھے کہ رنج وراحت اور شب وروز کا احساس تک نہ ہوتا تھا، ایک سال کی سخت محنت سے بہت سی

---

[۱] مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی، اریخ دعوت وعزیمت، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۲۰۲۴ء، حصہ پنجم، ص:۶۶

[۲] ماخذ سابق، ص: ۶۷

[۳] ابو محمد رحیم بخش دہلوی، حیاتِ ولی، دہلی یوتھ ویلفیئر ایسوسی ایشن، جامع مسجد، دہلی، ۲۰۰۸ء، ص:۲۴۸

کتابیں پڑھ ڈالیں اور اس محویت واستغراق کے ساتھ کہ بقدر ضرورت کچھ کھاپی لیتے اور تھوڑا سا آرام فرمالیتے، ورنہ دن ورات بجز کتب بینی کے دوسرا مشغلہ نہ تھا۔ جب شاہ صاحب نے مباحث علمیہ میں اس قدر دلچسپی کے ساتھ تھوڑا زمانہ گزارا اور عمر کے سترہویں سال میں قدم رکھا تو آپ کے والد بزرگوار جناب شیخ عبدالرحیم صاحب نے سفر آخرت کی طرف کوچ کیا۔[۴]

والد ماجد کے انتقال کے بعد شاہ صاحب نے کتب دینیہ وعقلیہ کا درس دینا شروع کیا اور آپ کا ہر علم میں شہرہ ہوگیا۔ علماً وعملاً استاد مان لیے گئے اور عوام وخواص کے معتقد علیہ تسلیم ہوئے[۵]۔ اس عہد میں تشنگانِ علومِ نبوت دور دراز شہروں اور ملکوں سے آپ کے در پر حاضری دیتے اور آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرتے اور اس سعادت کو اپنے لیے سرمایۂ افتخار سمجھتے تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ تقریباً بارہ سال تک درس وتدریس میں مشغول رہے، اس کے بعد آپ کی زندگی میں ایک نیا موڑ آیا، اور وہ مزید علمی پیاس بجھانے اور مدارج ترقی طے کرنے کے لیے حجاز معظم کا سفر کیا۔ شاہ صاحب کی علمی، فکری اور دعوتی وتجدیدی زندگی میں حجاز مقدس کا سفر اور قیام آپ کی کتاب زندگی کا ایک نیا باب تھا۔ اس سفر میں آپ نے علم حدیث کا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا اور وہاں کے شیوخ سے خوب علمی استفادہ کیا، جن میں ممتاز نام شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی کا ہے۔[۶]

علومِ دینیہ میں اس قدر بلند پایہ ہونے کے ساتھ فارسی ادب وکلام میں بھی آپ کا مقام بہت اونچا تھا۔ بارہویں صدی ہجری کے ممتاز شعراء میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ نے فارسی کی ہر صنف مثنوی، رباعی، قصیدہ اور غزلیات میں طبع آزمائی کی۔ فارسی نثر نگاری میں آپ کی تحریر کی خوبی یہ ہے کہ وہ اس دور کے عام نثر نگاروں کے رواج یعنی مسجع، مقفّی اور کثرت مترادفات سے پرعبارتوں سے ہٹ کر سادہ، شگفتہ اور رواں ہوتی جو سامانی اور غزنوی دور کے نثر نگاروں کی یاد تازہ کردیتی ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب کی تصانیف پچاس سے زائد ہیں، جن میں بیش تر کتب ورسائل فارسی زبان میں ہیں، ان مہتم بالشان تصانیف میں ایک تصنیف لطیف ''رسالہ دانشمندی'' ہے جو اس وقت

---

[۴] حیاتِ ولی، ص: ۲۵۰

[۵] حیاتِ ولی، ص: ۲۵۱

[۶] تاریخ دعوت وعزیمت، حصہ پنجم، ص: ۳۷

زیر تبصرہ ہے۔ یہ بیش قیمت رسالہ تعلیم و تعلم کے اصولوں اور مطالعہ و شرح کتاب کے طریقوں پر مشتمل ایک پر مغز اور مفید رسالہ ہے۔

میرے سامنے "رسالۂ دانش مندی" کے پانچ نسخے ہیں، جن میں بنیادی طور پر رسالۂ دانشمندی کا ایک نہایت نفیس قلمی نسخہ جو ۱۲۶۱ھ کا لکھا ہوا اور خط نستعلیق نیم شکستہ میں ہے اور جو کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی، ندوۃ العلماء لکھنؤ میں موجود ہے اور چار صفحات پر مشتمل ہے۔ نسخۂ ہذا کا مختصر تعارف:

رسالۂ دانشمندی از شاہ ولی اللہ، مجامیع: ۱۸۸/ کتب خانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔ خط نستعلیق نیم شکستہ۔ س ۱۲۶۱ھ۔ ص ۴۔ س ۱۶۔ سائز ۱۶×۲۳۔

آغاز: الحمد لله ملهم الحكم ومجزل النعم والصلاة والسلام على أفضل من أوتى الكتاب وفصل الخطاب۔

انجام: این است تقریر فن دانشمندی کہ از اساتذہ خود بسند مذکور کسب نمودہ ام والحمد للہ أولاً وآخراً تمام شد بتاریخ بیست ویکم شہر صفر ۱۲۶۱ھ۔

باقی چار نسخے جو میرے روبرو ہیں وہ مطبوعہ ہیں جن کی مختصر تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) المقالۃ الوضیۃ فی النصیحۃ والوصیۃ ورسالۂ دانشمندی، مطبع مصطفائی، لکھنؤ ۱۲۷۵ھ۔

(۲) وصیت نامہ ورسالۂ دانشمندی، منشی نول کشور، کانپور ۱۸۹۶ء۔ اس نسخہ میں رسالۂ دانشمندی وصیت نامہ کے حواشی میں قلم بند ہے۔

(۳) وصیت نامہ ورسالہ دانشمندی، مطبع مسیحی۔ کانپور ۱۲۷۳ھ۔ اس نسخے میں بھی "وصیت نامہ" کے حاشیہ میں "رسالۂ دانشمندی" درج ہے۔

(۴) السر المکتوم فی أسباب تدوین العلوم مع رسالہ فن دانشمندی، مطبع احمدی متعلق مدرسۂ عزیزی۔ دہلی ۱۹۰۳ء۔ پہلی کتاب عربی اور دوسری فارسی میں ہے۔ اور یہ دونوں رسالے مع متن اردو میں ترجمہ شدہ ہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے "رسالہ دانشمندی" میں علوم اسلامیہ کے اصول تعلیم و تعلم کے بارے میں مفید بحث کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ اصول تعلیم و مطالعہ ایک علاحدہ فن ہے۔ اگرچہ یہ رسالہ بنیادی طور پر مدارس اسلامیہ کے اساتذہ و طلبہ کو سامنے رکھ کر قید تحریر میں لایا گیا ہے، لیکن اس کے زریں اصول عصری تعلیمی اداروں کے اساتذہ و طلبہ کے لیے بھی رہنما و معاون ہیں۔

آج کے اس دور میں جبکہ اداروں میں تعلیم کی حالت بد سے بد تر ہوتی جارہی ہے، طلبہ میں صلاحیت ولیاقت کا فقدان نظر آتا ہے، ان کے اندر اگلوں کی سی قابلیت پیدا نہیں ہو پارہی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ آج ہماری درسگاہوں میں اُن تعلیمی اصول وضوابط سے چشم پوشی کی جاتی ہے جنہیں اپناکر حق تدریس بحسن وخوبی ادا کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ ظاہر سی بات ہے کہ جب کسی بھی کام میں اس کے اصول پیش نظر نہ ہوں تو اس میں نقصان ضرور در آئے گا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے یہ زریں اور بیش قیمت اصول، تعلیم وتعلم کے راہ گیروں کے لیے ایک بہترین رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں۔ رسالہ ہٰذا میں شاہ صاحب نے اپنے والد ماجد شاہ عبد الرحیم دہلوی سے لے کر شیخ ابوالحسن اشعری تک کے اکابر کی پوری سند نقل کی ہے جن کے واسطوں سے ان تک یہ فن دانشمندی پہنچا ہے۔ پھر کتاب دانی کے تین درجے بتائے ہیں: پہلا درجہ یہ ہے کہ کتاب کا مطالعہ کرے اور اس کی حقیقت کو تحقیق کے ساتھ معلوم کرے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ جو کچھ اس نے پڑھا ہے اس کا درس دے اور طلبہ کو اس کا مطلب اچھی طرح سمجھائے۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ اس کی شرح یا اس پر حاشیہ لکھے اور اس کی حقیقت کی دریافت میں خوب جدوجہد کرے۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

> کتاب دانی ...... دان بر سہ مرتبہ می باشد یکی آں کہ مطالعہ کند کتاب را و حقیقت آں را بوجہ تحقیق دریابد، دوم آں کہ درس گوید و حقیقت آں را بشاگرداں بفہماند، سوم آں کہ شرح یا حاشیہ بر آں بنویسد و در کشف حقیقت آن مبالغہ نماید۔ (۷)
>
> (کتاب سمجھنے کے تین درجے ہیں: پہلا درجہ یہ ہے کہ کتاب کا مطالعہ کرے اور اس کی حقیقت کو تحقیق کے ساتھ معلوم کرے، دوسرا درجہ یہ ہے کہ اس کا درس دے اور طلبہ کو اس کا مطلب اچھی طرح سمجھائے اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ اس کی شرح یا اس کا حاشیہ لکھے اور اس کی حقیقت کی دریافت میں خوب جدوجہد کرے)۔

اس کے بعد ان پندرہ تعلیمی اصولوں کو جو اصلاً مندرجہ بالا کتاب دانی کے تینوں مراتب کی شرح وتفصیل ہے، قید تحریر میں لاتے ہیں اور مدرسین وشارحین کے لیے ان کا اہتمام ضروری قرار دیتے ہیں:

---

(۷) رسالہ دانش مندی، مخطوطہ، ص: ۲

باید دانست کہ مردِ عالم چوں خواہد کہ شاگردان خود را کتابی از کتب علوم درس گوید بطریق درایت و تحقیق لابدست اورا از رعایت پانزدہ چیز۔ وہمچنیں اگر شخصی خواہد کہ شرح کتابی بکند لابدست اورا محافظت برایں۔[۸]

(معلوم ہونا چاہیے کہ جب کوئی عالم شخص اپنے شاگردوں کو درسی علوم کی کتابوں میں سے کسی کتاب کا علم و تحقیق کے ساتھ درس دینا چاہے تو اس کے لیے پندرہ باتوں کا لحاظ کرنا انتہائی ضروری ہے۔ اور اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کتاب کی تشریح کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اس کے لیے بھی ان امور کی پابندی لازم ہے)۔

وہ پندرہ اصول تعلیم و تعلم حسب ذیل ہیں:

اوّل: ضبطِ مشکل یعنی عبارت میں جو اسماء وافعال واقع ہوئے ہوں ان کی وضاحت کر دیں اور اگر مشکل مقام ہو تو اس کے حرکات وسکنات کو بھی بیان کریں۔ اس طرح اس کا معجمہ یا مہملہ ہونا یعنی نقطہ دار یا بے نقطہ ہونا بھی طلبہ کو بتا دیا جائے تا کہ وہ عبارتی غلطی سے محفوظ ہوں۔

دوم: شرحِ غریب یعنی اگر کوئی لفظ قلیل الاستعمال ہو اور اس کا معنی طلبہ کی سمجھ میں نہ آرہا ہو تو لغت واصطلاح کے مطابق اس کی تشریح کر دیں۔

سوم: توضیحِ مغلق یعنی عبارت میں کوئی ترکیب یا صیغہ شاگردوں کے ذہنوں پر دشوار ہو تو علم نحو وصرف کی روشنی میں اس کو حل کریں۔

چہارم: تصویرِ مسئلہ یعنی کتاب میں کوئی ایسی بات مذکور ہو جو شاگردوں کے فہم سے پرے ہو تو واضح عبارت کے ذریعہ اس کو سمجھائے اور اس کی مثالیں بھی دے تا کہ وہ مسئلہ اچھی طرح ذہن نشیں ہو جائے۔

پنجم: تقریبِ دلائل یعنی اگر کتاب میں کسی مسئلہ پر دلیل قائم کی گئی ہو تو اس کے پیچیدہ مقدمات کو بیان کرے۔

ششم: تعریفات کی تحقیق، قیود کے فوائد کے بیان کے ساتھ، بایں طور کہ زائد از تعریف باتیں خارج ہو جائیں۔

---

[۸] رسالہ دانش مندی، مخطوطہ، ص:۲

ہفتم: قاعدۂ کلیہ کو اس انداز میں اچھی طرح مبرہن کیا جائے کہ اس میں لازمی حدود و قیود بھی مذکور ہوں، اور ان سے بننے والی اقسام کو واضح صورت میں مثالوں سمیت بیان کر دیا جائے۔ اور اگر ان میں کچھ شرائط وغیرہ پائی جائیں تو اس انداز سے انھیں ذکر کیا جائے کہ کوئی شرط یا قید ایسی نہ رہ جائے جو اس قاعدے کا فائدہ محدود کر دے۔

ہشتم: اگر کسی چیز کی تعریف کے بعد اس کو مختلف اقسام میں تقسیم کرنا مقصود ہو تو وجہ حصر استقرائی طریقے سے یا عقلی دلیل کے ساتھ بیان کرنا چاہیے تاکہ معلوم ہو جائے کہ اصل مطلوب اپنی مختلف قسموں میں بند ہے، اس سے باہر نہیں ہے۔ اور اسی طرح یہ بھی واضح کر دیا جائے کہ اس تقسیم میں ایک بات کو کیوں مقدم کیا ہے اور دوسری کو کیوں مؤخر کیا گیا ہے؟

نہم: دو تلبیسوں کے درمیان فرق کرنا یعنی بادی النظر میں دو قسم یا دو نظریۂ مخالف مشتبہ ہوں تو واضح انداز سے ان دونوں کے درمیان فرق کو ثابت کرے۔

دہم: دو مختلف چیزوں کے درمیان تطبیق کرنا یعنی اگر مصنف کی عبارت میں کسی دو جگہ میں اختلاف ہو تو اس اختلاف کو حل کرے، خواہ دونوں دلیل کے مطابق ہوں یا ایک مطابق ہو اور دوسری تضمینی یا التزامی طور پر ہو۔

یازدہم: ظاہر میں وارد ہونے والے شبہات کا ازالہ۔

دوازدہم: اس حوالے کی توضیح جہاں حوالہ ذکر کیا گیا ہو اور جہاں کہا گیا ہو "وفیہ نظر" وہاں نظر کی وضاحت اور اس سوال مقدر کا بیان جہاں اشارہ کیا گیا ہو۔

سیزدہم: کتاب کی عبارت کا ترجمہ طلبہ کی زبان میں کرنا اگر ان کی زبان کتاب کی زبان کے موافق نہ ہو۔

چہاردہم: توجیہات کی تنقیح اور ان میں سب سے اچھی کی تعیین یعنی جہاں شارحین میں اختلاف ہو۔ ایک جماعت کچھ تشریح کرتی ہو اور دوسری جماعت کچھ اور، تو ان تشریحات کی تنقیح کرے اور ان میں بہترین کی تعیین کرے اور قیاس کو عمل میں لائے۔

پانزدہم: سہولت تقریر یعنی اوّل الذکر بارہ باتوں کو واضح، مختصر، ذہن سے قریب تر اور آسانی سے سمجھ میں آجانے والی عبارت کے ساتھ عمل میں لائے۔

شاہ صاحبؒ اِن پندرہ تعلیم و تعلم کے اصولوں کو قلمبند کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ”چوں ایں پانزدہ صنعت را احقاق نماید کامل شد در تدریس و در شرح کتب“[۹] یعنی جب کوئی شخص ان پندرہ نکات کا حق ادا کر دے گا تو وہ تدریس اور شرح کتب میں کامل و ماہر ہو جائے گا۔

آخر میں اساتذہ کے لیے چند ہدایات لکھتے ہیں:

اولاً: مشفق استاذ کو چاہیے کہ اجمالی طور پر اپنے شاگردوں کو ان امور سے مطلع کرے۔

ثانیاً: جہاں موقع ہو اپنے شاگردوں کو بتائے کہ یہاں شارح کی یہ غرض ہے اور یہاں یہ مقصد ہے۔

ثالثاً: طلبہ سے کہے کہ کتاب کے مطالعے میں ان باتوں کو اپنے پیش نظر رکھیں اور اپنے فکری گھوڑے کو اسی میدان میں دوڑائیں، اس سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کریں۔

رابعاً: شاگرد کے مطالعے کو اپنے مطالعے سے مقابلہ کرے، پھر جو کچھ اس کے مطالعے میں غلطی نظر آئے اس کو اس غلطی پر آگاہ کرے، بایں طور کہ غلطی اس کے علم میں آجائے۔

خامساً: کسی کتاب کی شرح یا حاشیہ لکھنے کا حکم دے اور اس کی لیاقت کا امتحان لے تاکہ تعلیم و تربیت کا حق مکمل طور پر ادا ہو۔

یہ رسالہ، فن تحقیق کے طلبہ و علماء کے لیے مشعلِ راہ ہے، لہٰذا جو شخص بھی تحقیق و تصنیف اور تدریس سے تعلق رکھتا ہو، اسے چاہیے کہ وہ اس رسالہ کو اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اپنا حرزِ جاں بنائے اور اس کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق اپنے علمی و فکری کاموں کو انجام دے۔

کتابیات

(۱) مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، تاریخ دعوت و عزیمت، مجلس تحقیقات و نشریاتِ اسلام، لکھنؤ، ۲۰۲۴ء

(۲) ابو محمد رحیم بخش دہلوی، حیات ولی، دہلی یوتھ ویلفیئر ایسوسی ایشن،، جامع مسجد، دہلی، ۲۰۰۸ء

(۳) رسالۂ دانشمندی، نسخۂ مخطوطہ، محفوظہ علامہ شبلی نعمانی لائبریری، دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، مجامیع : ۱۸۸

(۴) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، وصیت نامہ ور سالۂ دانشمندی، منشی نول کشور، کانپور، ۱۸۹۶ء

(۵) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، وصیت نامہ ور سالۂ دانشمندی، مطبع مسیحی، کانپور، ۱۲۷۳ھ

(۶) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، المقالۃ الوضیۃ فی النصیحۃ والوصیۃ، مطبع مصطفائی، لکھنؤ، ۱۲۵۷ھ

(۷) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، السر المکتوم في أسباب تدوین العلوم مع رسالۂ فن دانشمندی، مطبع احمدی، دہلی، ۱۹۰۳ء

[۹] رسالہ دانش مندی، مخطوطہ، ص: ۴

تعلیم اور مولانا مناظر احسن گیلانی

ڈاکٹر محمد ارشد

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

marshad@jmi.ac.in

مولانا سید مناظر احسن گیلانی(۱۸۹۲-۱۹۵۶ء) کا شمار یوں تو شبلی اسکول میں نہیں ہوتا لیکن تعلیم وعلوم اسلامی کے سلسلے میں ان کی فکری جولانیوں کو دیکھتے ہوئے انہیں شبلی اسکول کا نمائندہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے نظام تعلیم وتربیت کا وہ نہ صرف گہرا مطالعہ رکھتے تھے بلکہ اس ضمن میں ان کی اپنی الگ رائے انہیں عصر جدید کی پوری مسلم علمی روایت میں نمایاں مقام عطا کرتی ہے۔ ان کی تصنیف "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت" ایک شاہ کار ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے نظام تعلیم وتربیت کی تاریخ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ جابجا اصلاحی تجاویز بھی پیش کی ہیں۔ ان کا 'نظریہ وحدت نظام تعلیم' بھی ایک ایسی ہی تجویز ہے جس پر نئی علمی بحث شروع کرنے کی شدید ضرورت آج بھی ہے۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانی ہندوستانی نظام تعلیم کی اس روایت کے شاید آخری فیض یافتہ ہیں جنہوں نے خیر آباد اور دیوبند دونوں اسکولوں سے یکساں طور پر استفادہ کیا تھا۔ وہ عالم بے بدل تھے۔ دینی علوم وتعلیم میں مہارت کے ساتھ رواداری اور روشن خیالی بھی ان میں کمال درجے کی تھی۔ معقولات ومنقولات پر انہیں یکساں عبور حاصل تھا اسی وجہ سے ان کے افکار وخیالات میں جامعیت اور وسعت بھی پائی جاتی ہے۔ مولانا گیلانی ہندوستانی علما کی اس روایت کے بھی امین تھے جو اسرار شریعت کے ساتھ طریقت کے رموز وآگہی کو مشترکہ طور پر پرورش وپروان چڑھاتی ہے۔ اختصاص کے دور میں بھی وہ ہمہ جہتی کی مثال تھے۔ بیسویں صدی کے راسخ العقیدہ علماء کی صف میں ان کی حیثیت ایک ایسے عالم کی ہے جس کی دینی امور ومسائل پر بھی گہری نظر ہے اور جو اپنے زمانے اور حالات اور تقاضوں سے بھی اچھی واقفیت رکھتا ہے۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی پوری تعلیم و تربیت مشرقی طرز کی دینی درسگاہوں میں ہوئی۔ تعلیمی زندگی کے ابتدائی ماہ و سال ٹونک (راجستھان) جیسے مرکز علم و حکمت میں گزرے جہاں انہوں نے خالص معقولی خیر آبادی ماحول میں مولانا برکات احمد ٹونکی جیسے نادرہ روزگار معلم و مربی سے اخذ و استفادہ کیا۔ مزید دینی تعلیم کے لیے ازہر ہند دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا تو وہاں شیخ الہند مولانا محمود حسن اور علامہ انور شاہ کشمیری کے زیر سایہ خانوادہ ولی اللہی کی نسبتاً منقولی علمی روایت سے کسب فیض کیا۔ اور پھر تلاش روزگار نے انہیں مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کی علمی قدر دانی کی بدولت حیدرآباد کے جدید مرکز علم و فن جامعہ عثمانیہ سے وابستہ کر دیا۔ قیام حیدرآباد کے دوران مولانا مناظر احسن گیلانی کو جس طرح کے تجربات ہوئے، ان کے سبب مولانا کے ذہنی افق میں وسعت پیدا ہوئی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے فرنگی محل اور ولی اللہی دونوں مکاتب فکر کے مدرسوں میں تعلیم پائی، فلسفہ و منطق کے ساتھ تفسیر و حدیث کا بھی خاص ذوق رکھتے تھے اور دکن کی ریاست حیدرآباد میں قائم ہونے والی پہلی یونیورسٹی، جامعہ عثمانیہ، ان کا میدان عمل رہی۔ وہ ہندوستان کے جدید نظام تعلیم سے بخوبی آشنا تھے تو قدیم نظام تعلیم پر بھی ان کی گہری نگاہ تھی۔ جدید ہندوستان میں وہ شبلی کے بعد شاید پہلے اہم ماہر تعلیم ہیں جو نظام تعلیم کی دوئی پر شکوہ کناں ہی نہیں بلکہ اس کا ایک بہتر متبادل بھی پیش کرتے ہیں۔ مولانا گیلانی کے تعلیمی افکار و خیالات کو جاننے کا بنیادی ماخذ ان کی کتاب "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" ہے۔ بقول ابو سلمان شاہ جہاں پوری:

> ہندوستان کو وطن بنانے کے بعد مسلمانوں نے اس ملک میں تعلیم و تربیت کا جو نظام قائم کیا تھا اس کتاب میں اس کی عجیب و غریب خصوصیات کو صحیح اور معتبر تاریخی شہادتوں کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ اساتذہ، طلبہ، طریقہ تعلیم، نصابی تغیرات، طلبہ کے قیام و طعام، کتابوں کی فراہمی کے انتظامات، ان کلی مباحث کے ساتھ کتابت میں مسلمانوں کی حیرت انگیز چابک دستیاں، اشاعت کتب کے طریقے، مسلمانوں سے پہلے اس ملک میں کاغذ کا فقدان، کاغذ سازی کے کارخانے، کاغذ کے اقسام، سلاطین اور علماء کا تعلیم سے تعلق، ہندوستان میں تعلیمی نصاب کی ہر زمانے میں افادے کے لحاظ سے برتری، بیرون ہند کے اسلامی ممالک میں ہندوستانی علماء کا امتیاز و تفوق۔ ان کے سوا بلا مبالغہ بیسیوں نکات، حقائق جن کا مختلف مسائل

سے تعلق ہے، اس کتاب میں پہلی مرتبہ پیش کیے گئے ہیں۔[۱]

ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم پر غور و فکر اور بحث و گفتگو کا ایک طویل سلسلہ جو انیسویں صدی کے وسط میں مسلم نظام تعلیم پر انگریزوں کے ذریعے لگائی جانے والی ضرب کاری کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔ مسلمان علماء اور ماہرین نے اپنے اپنے طور پر اس مسئلے پر غور و فکر کیا اور اس کے حل کے لیے حتی الامکان کوشش بھی کی۔ ہندوستانی مسلمانوں کی بدقسمتی یہ رہی کہ انہوں نے جس نظام تعلیم کے خلاف جدوجہد کی تھی نتیجے کے طور پر وہ خود ہی اس نظام تعلیم سے متاثر ہو گئے اور انجام کار ہندوستانی مسلم معاشرہ میں تعلیم کے دو مستقل اور متوازی دھارے چل پڑے جو ایک دوسرے سے متصادم تھے۔ شبلی جو ہندوستان میں اصلاح نصاب کی سب سے اہم تحریک 'ندوۃ العلما' کے رکن رکین تھے اور جنہوں نے ہندوستانی نظام تعلیم میں اصلاح کا عملاً بیڑا اٹھایا، وہ بھی یہ لکھنے پر مجبور ہیں کہ:

> ہر گروہ جس قسم کی تعلیم کا حامی ہے، چاہتا ہے کہ تمام ملک میں وہی تعلیم پھیل جائے، اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ دونوں گروہوں میں تقابل، مسابقت اور محاسدہ پیدا ہو، چنانچہ ایسا ہوا، صرف یہ امتیاز باقی رہا کہ پست حوصلہ لوگوں نے علانیہ اپنے حریف مدارس اور انجمنوں کی برائی شروع کی اور مہذب حضرات نے دل آزاری اور بدگوئی سے احتراز کیا۔[۲]

شبلی کے بعد بھی حالات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی، اصلاح کے لیے ہونے والی کوششیں بظاہر ناکام ہی رہیں۔ بقول مولانا عتیق الرحمان عثمانی:

> مسلمانانِ ہند کی تعلیمی مشکلات کا حل اب تک زعمائے اسلام کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی تعلیمی اصلاح کی ضرورت اس شد و مد کے ساتھ پہلے کبھی محسوس نہیں کی گئی جتنی اب کی جاتی ہے... ان سب امور کے باوجود مسلمانوں کی تعلیمی مشکلات کا کوئی خاطر خواہ حل دستیاب نہیں ہو سکا ہے۔[۳]

---

[۱] شاہ جہاں پوری، ڈاکٹر ابو سلمان، مولانا سید مناظر احسن گیلانی: شخصیت اور سوانح، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۲ء، ص: ۶۱۔ ۶۲۔

[۲] نعمانی، شبلی، مقالات شبلی، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، یوپی، جلد: ۳، ۲۰۰۹، ص: ۱۴۲۔

[۳] گیلانی، مولانا سید مناظر احسن، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، ندوۃ المصنفین، دہلی، جلد اول، ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۹۴۳ء، ص: ۲۔

حالانکہ شبلی نے اپنے طور پر ندوہ کی حد تک بعض تجربات کرنے کی کوشش کی، یہ تجربات محض نظری بھی نہ تھے، اس کے باوجود انہیں کامیابی نہ ملی۔ وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے اور سمجھتے تھے کہ جو دو طریقہ ہائے تعلیم ہندوستانی مسلمانوں میں رائج ہو چکے ہیں ان کو ختم کر کے ایک طریقہ تعلیم جاری کرنا محال ہے، اس لیے انہوں نے دونوں میں اصلاح کی بات کی[۴] جب کہ وہ بھی نظری طور پر نظام تعلیم کی وحدت کے ہی حامی ہیں۔ لکھتے ہیں:

ہم مسلمانوں کے لیے نہ صرف انگریزی مدرسوں کی تعلیم کافی ہے نہ قدیم عربی مدرسوں کی، ہمارے درد کا علاج ایک معجون مرکب ہے جس کا ایک جز مشرقی اور دوسرا مغربی ہے۔[۵]

شبلی جس معجون مرکب کی بات کرتے ہیں، ان کی وفات کے تقریباً تیس برس بعد مولانا مناظر احسن گیلانی نے اسے مزید وسعت و جامعیت کے ساتھ 'نظریہ وحدت نظام تعلیم' کی شکل میں اپنی تجویز میں پیش کیا۔ یہ بڑی ہی کار آمد تجویز تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ شبلی کے علمی جانشین مولانا سید سلیمان ندوی نے اس تجویز کو شبلی اکیڈمی کے رسالہ معارف میں سب سے پہلے شائع کیا۔[۶]

مولانا گیلانی کے مطابق مغل عہد زوال میں بعض ایسے اقدامات ہوئے جن کے سبب علم کا رشتہ روزگار سے ٹوٹ گیا اور جب علم کا رشتہ روزگار سے ٹوٹا تو شرفا کے علمی خانوادے بھی مجبور ہوئے کہ سپہ گری کو بطور پیشہ اختیار کریں کیوں کہ بہ وجوہ وہاں روزگار کے مواقع تھے۔ جو تھوڑی بہت قدر ہوئی وہ بھی صرف معقولی مولویوں کی۔ اس صورت حال میں میکالے کی تعلیمی رپورٹ آئی جس میں مسلمانوں کے نظام تعلیم کو فرسودہ قرار دیتے ہوئے نئے یورپی نظام تعلیم کو پورے ملک میں متعارف کرانے کی بات کہی گئی تھی۔ مولانا گیلانی کے الفاظ میں:

میکالے کی تعلیمی رپورٹ میں جب مشرق اور مشرق کے سارے علمی مجاہدات کو یورپ کی کتابوں کی ایک الماری کے برابر ماننے سے بھی انکار کیا گیا تھا، اسی بنیاد پر قدیم تعلیم کا سارا نظام اچانک بدل دیا گیا۔ اور ہم جاہلوں کو تہذیب و تمدن کی روشنی میں لانے کے لیے کلیات و جوامع

---

[۴] ماخذ سابق، مقالات شبلی، جلد:۳، ص:۱۴۱-۱۴۶۔

[۵] ماخذ سابق، ص:۱۶۳۔

[۶] گیلانی، مولانا سید مناظر احسن، میرا مجوزہ تعلیمی خاکہ، معارف، اعظم گڑھ، جولائی ۱۹۴۵ء، ص:۱۵-۵۔

کے جال ملک کے طول عرض میں پھیلا دیے گئے۔[۷]

اس کا نتیجہ کیا نکلا انہیں کے الفاظ میں سنیے: ''ادھر تعلیم کا نظام بدلا اور معمولی کشمکش کے بعد بڑے بڑے علما، فضلا، مشائخ اور صوفیا کے گھرانوں کی اولاد کالجوں میں بھر گئی''۔[۸]

علما کا بہت چھوٹا سا طبقہ تھا جس نے نئے نظام تعلیم کے خلاف جد و جہد کی۔ اس نے پرانے طریقہ تعلیم کو ہی اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا، چونکہ اب اس نظام تعلیم کے فارغین کے لیے نئے نظام حکومت میں روزگار کے مواقع نہیں تھے، اس لیے پورا نصاب تعلیم دینی متصور کر لیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مسلمان جنھوں نے تیرہ سو برس تک علم کی دوعملی تقسیم کو شدت کے ساتھ روکے رکھا تھا، خود بخود اس دوعملی کا شکار ہو گئے۔ مولانا گیلانی اس دوعملی تقسیم کے سخت خلاف ہیں۔ ان کے مطابق مسلمانوں کے حالات کی خرابی میں تعلیمی نصاب کی دوعملی کا اہم کردار ہے اور اسے دور کرنے کی ضرورت ہے۔ لکھتے ہیں:

> آج تو تعلیم کو دو حصوں پر تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک کا نام دینی علوم اور دوسرے کا دنیاوی علوم نام رکھا گیا ہے۔ دونوں کی تعلیم گاہیں الگ الگ ہیں، دونوں کا نصاب جدا جدا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر نصاب کے پڑھنے والے اس نصاب اور اس کے آثار و نتائج سے قطعاً بے گانہ ہیں جسے انہوں نے نہیں پڑھا، ملک میں پڑھے لکھے لوگوں کی دو مستقل جماعتیں قائم ہو گئی ہیں... علم کے نمایندے بجائے ایک کے دو طبقے ہیں، عوام پریشان ہیں کہ کس کے پیچھے جائیں۔[۹]

اصلاح نظام و نصاب تعلیم کی مولانا گیلانی کی تجویز

کسی بھی تعلیمی نظام اور نصاب کے زندہ اور متحرک رہنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے لوگوں اور زمانے کی ضروریات کے مطابق ہو اور اس میں اصلاح کا عمل بھی مسلسل جاری رہے۔ مسلم دور حکومت میں ہندوستان میں جو نظام تعلیم تھا بلاشبہ وہ اس وقت کے مذاق کے مطابق لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرتا تھا۔ اس نصاب اور نظام کے ساتھ مشکل اس وقت پیش آئی جب یہاں کے

---

[۷] ماخذ سابق، ص: ۲۱۷۔

[۸] ماخذ سابق، ص: ۲۱۷۔

[۹] ماخذ سابق، ص: ۲۳۱۔

حالات بدل گئے۔ کیونکہ بدلے ہوئے حالات میں شاید یہ نظام و نصاب زیادہ کارگر نہیں رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں میں روایتی نظام تعلیم میں اصلاح کی کوششوں کا سلسلہ بھی تقریباً اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ موجودہ نظام تعلیم۔ اصلاح نصاب کی سب سے بڑی اور اہم تحریک ندوہ، دارالعلوم دیوبند کے قیام کے صرف پچیس برس بعد شروع ہو چکی تھی۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے اصلاح نصاب کی ان تحریکات کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ان کے زمانے تک مسلمانوں میں اصلاح نصاب کی جو تحریکیں جاری تھیں، ان کے مطابق ان کی تین نوعیتیں تھیں۔ ایک کا تعلق حدیث کے نصاب اور اس کے طریقہ تدریس سے تھا۔ دوسری عربی زبان وادب کی اہمیت کے پیش نظر جاری تھی کہ عربی زبان کی ہمہ گیر معرفت کے بغیر قرآن کو سمجھنا مشکل ہے۔ تیسری کا تعلق تفسیر سے تھا کہ نصاب درس میں شامل تفسیر جلالین بہت ہی مختصر ہے۔ مولانا گیلانی اصلاح نصاب کی ان کوششوں یا تحریکوں سے اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ موجودہ حالات میں نصاب تعلیم کو دینیات اور معقولات کی متعدد کتابوں کے درس و تدریس سے بوجھل بنانے کی بجائے ہندوستان کے اولین اور قدیم نصاب تعلیم کی طرف رجوع کرنا چاہیے جس میں درسی کتب کی تعداد مختصر تھی۔ لکھتے ہیں:

> خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک پچیس تیس سال کے غور و فکر سے میں نصاب کے مسئلے میں جس نتیجے تک پہنچا ہوں، وہ یہی ہے کہ تبحر واحاطہ، مطالعہ و وسعت معلومات کے لیے نہیں بلکہ استاد سے پڑھنے اور درس کی حد تک چند مختصر فقہی متون کے سوا بزرگوں نے دینیات (یعنی حدیث، تفسیر، فقہ) کے لیے اگر ان تین کتابوں (جلالین، مشکوٰۃ، ہدایہ و شرح وقایہ) کو کافی خیال فرمایا تھا تو اس میں انہوں نے کوئی غلطی نہیں کی تھی، بلکہ اس ذریعے سے انہوں نے تعلیمی نظام کی وحدت کو قائم رکھنے کی جو راہ نکالی وہ ایسی عجیب و غریب بات ہے کہ ہر زمانے میں اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔[10]

مولانا گیلانی نے ان تجربات پر تنقید کی ہے جو ان کے زمانے میں جدید تعلیم گاہوں میں دینیات کے مضمون کے اضافے اور قدیم تعلیم گاہوں میں انگریزی و سائنس کی تعلیم کی شکل میں کیے

---

[10] ماخذ سابق، ص: ۲۴۶۔

جارہے تھے۔ اتفاق سے نصاب تعلیم کے ساتھ اس طرح کے تجربات کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> میرے نزدیک تو ان ساری تباہ کاریوں اور بربادیوں کے انسداد کی واحد تدبیر کوئی نئی تدبیر نہیں بلکہ نظام تعلیم کی وحدت کا قدیم اصول ہی ہو سکتا ہے۔ ہمیں کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں بلکہ بزرگوں نے سیکڑوں، بلکہ اب تو ہزار برس بھی کہا جا سکتا ہے، الغرض اپنے طویل تجربوں کے بعد تعلیم کی جو راہ بنادی تھی اگر اسی راہ پر غور کیا جاتا تو میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ مشکلات کے حل کی راہ اسی سے پیدا ہو سکتی تھی۔[11]

قدیم نصاب تعلیم کی جامعیت کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

> قدیم نصاب میں دینیات کے مضامین (قرآن، حدیث، فقہ) کو محوری اور اساسی مضمون قرار دے کر درس کے لیے ہر مضمون کی ایک ٹھوس، جامع، حاوی، مختصر کتاب کا انتخاب کر کے دینیات کے لیے پورے نصاب میں، جیسا کہ میں نے عرض کیا صرف تین کتابوں کو کافی قرار دیا گیا اور اس کے بعد پڑھنے والوں کے لیے ایک وسیع میدان چھوڑ دیا گیا جس میں ضرورت تھی تو فارسی کے نظم و نثر کی بیسیوں کتابوں کی، مکتبی زندگی میں اور منطق، فلسفہ، ریاضی، ہندسہ، اصول، کلام، ادب عربی کی تقریباً ساٹھ ستر کتابوں کی، اعلیٰ عربی تعلیم میں گنجایش نکل آئی، پھر جب تک موقع تھا ان غیر دینیاتی مضامین کی حیثیت اختیاری مضامین کی رہی اور جیسے جیسے زمانے کا مطالبہ بڑھتا گیا ان مضامین میں سے جن کو لازم قرار دینے کی حاجت ہوئی، انہیں لازم قرار دے دیا گیا اور یوں ہی مسلمانوں کے اس واحد تعلیمی نظام سے منطقی ملا، فلسفی ملا، مہندس ملا، ادیب ملا، شاعر ملا، الغرض باوجود ملا ہونے کے جس جس چیز کی ضرورت تھی وہی بن بن کر نکلتے رہے۔[12]

مولانا گیلانی جدید تعلیمی نظام کو بھی اسی طرز پر استوار کرنے پر زور دیتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ جس طرح اب سے پہلے بنیادی دینیاتی تعلیم کے ساتھ مروجہ مضامین کی تعلیم حسب ضرورت ایک ہی تعلیمی نظام کے اندر فراہم کی جاتی تھی اسی طرح موجودہ زمانے میں بھی مروجہ تعلیمی نظام کے اندر

---

[11] ماخذ سابق، ص:۲۴۹۔

[12] ماخذ سابق، ص:۲۴۹۔۲۵۰۔

ہی بنیادی دینیاتی تعلیم کی گنجایش آسانی کے ساتھ نکل سکتی ہے۔ لکھتے ہیں:

> کیا بہ سہولت تمام آج بھی بزرگوں کے اسی تعلیمی منہاج کو سامنے رکھ کر ہم حقیقی اور خالص دینیات کے ان اساسی مضامین کی ان ہی تین کتابوں کو باقی رکھتے ہوئے وہی فارسی جو کچھ دن پہلے ہندوستان کی حکومت کی زبان تھی، اور وہی معقولات جن کی مغل دربار میں قیمت ملتی تھی، بجائے ان غیر دینیاتی مضامین کے عصر حاضر میں حکومت کی جو زبان ہے اور موجودہ حکومت جن علوم و فنون کے پڑھنے والوں کا اپنی ضرورتوں کے لیے مطالبہ کر رہی ہے، ہم زمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے ٹھیک اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر، اپنے نصاب میں ان جدید مضامین کو شریک کر کے بجائے فلسفی ملا کے سائنٹسٹ ملا اور بجائے منطقی ملا کے سائکلوجسٹ ملا وغیرہ ملاؤں کی مختلف قسم نہیں پیدا کر سکتے۔ (۱۳)

مولانا گیلانی کا خیال ہے کہ بنیادی دینی تعلیم کے لیے مذکورہ تین کتابیں کافی ہیں، کیونکہ دینی ضرورت اگر ان کتابوں سے پہلے کے زمانے میں پوری ہو سکتی تھی تو موجودہ زمانے میں بھی یہ کتابیں دینی ضرورت کو پورا کرنے کی اہل ہیں۔ (۱۴) ان کے مطابق موجودہ نظام تعلیم کے گریجویشن تک کے نصاب میں اس کی پوری پوری گنجایش موجود ہے کہ دینیات کی ان تین کتابوں کو شامل نصاب کیا جا سکے۔ البتہ مولانا کو شاید اس بات کا احساس تھا کہ آیندہ کے ہندوستان میں جو طریقہ تعلیم رائج ہوگا اس میں شاید ایسا ہونا ممکن نہ ہو۔ اس لیے وہ بحیثیت مجموعی ہندوستانی مسلمانوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ:

> اس طوفان میں ان تین کتابوں کے لیے جگہ نہ نکل سکتی ہو تو کیوں نہیں ہم اپنے سارے دینی اور دنیوی تعلیمی نظامات کو بجائے دوئی کے وحدت کے رنگ میں ڈھال لیں اور اپنا نصاب خود بنائیں۔ (۱۵)

مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے 'ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت' میں ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ بیان کرنے کے ساتھ تجاویز اور مشورے بھی دیے ہیں۔ چونکہ وہ خود بھی

---

(۱۳) ماخذ سابق، ص:۲۵۰۔

(۱۴) ماخذ سابق، ص:۲۵۸۔

(۱۵) ماخذ سابق، ص:۲۵۱۔

تعلیم کے شعبے سے وابستہ تھے اور روایتی و عصری دونوں طرح کے تعلیمی اداروں کا تجربہ رکھتے تھے اس لیے ان کے مشورے بہت ہی عملی قسم کے ہیں۔ انہوں نے اپنے مجوزہ نصاب تعلیم کا جو اجمالی خاکہ پیش کیا ہے اس کے مطابق ابتدائی مکتبی تعلیم کے نصاب میں اگر حسب ذیل امور کو پیش نظر رکھ لیا جائے تو نو سال کی میٹرک کی تعلیم میں انگریزی زبان اور حساب کے ساتھ بچوں کے اندر اتنی صلاحیت پیدا ہو جائے گی کہ کلیاتی (کالج کی) تعلیم کے نصاب میں قرآن و حدیث و فقہ کی ان تین کتابوں کو بی اے تک کے چار سال میں دوسرے اختیاری مضامین کے ساتھ پڑھ سکیں۔ مولانا نے ان امور کو اصول پنج گانہ کا نام دیا ہے:

۱۔ صرف وہی چیزیں پڑھائی جائیں جو استادوں سے پڑھے بغیر نہیں سیکھی جا سکتیں۔

۲۔ اردو میں ترقی کرنے کے لیے اردو ہی کتابوں کا مسلسل سالہا سال تک پڑھائے چلا جانا کوئی مفید نتیجہ نہیں پیدا کرتا بلکہ اردو میں قوت پیدا کرنے کے لیے فارسی اور فارسی میں بچوں کو قوی کرنے کے لیے عربی کا سکھانا ضروری قرار دیا جائے۔

۳۔ عربی زبان کے صرف اسی حصے کو مسلمانوں کے لیے ضروری سمجھا جائے جس میں ان کے دینی معلومات ہیں باقی عربی کے دوسرے حصے کو اعلیٰ تعلیم میں بطور اختیاری مضامین کے چاہا جائے تو رکھا جا سکتا ہے۔ بلکہ اس کے اختصاصی علماء بھی اختصاصی درجوں میں اگر پیدا کیے جائیں تو وہ ایک دوسری ضرورت ہے۔ لیکن ہر پڑھے لکھے مسلمان کو جس عربی کی حاجت ہے وہ صرف اسلامی ادبیات ہی والی عربی ہے۔

۴۔ اس عربی کو قصہ کہانی والی کتابوں کے ذریعے سکھانے کی جگہ خود قرآنی پاروں اور فقہی و حدیثی متون کے ذریعے سکھانا زیادہ مفید اور ضروری ہے کہ یہ یک کرشمہ دو کار ہے۔

۵۔ اسلامی ادبیات والی عربی کے لیے نحوی و صرفی قواعد کے ان طول طویل سلسلوں کی حاجت نہیں، جو کسی زمانے میں دماغی تمرین اور ذہنی تشحیذ کے لیے پڑھائے جاتے تھے۔[۱۶]

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ دینیاتی مضامین کا کیا اتنا مختصر نصاب (جلالین، مشکوٰۃ اور ہدایہ

---

[۱۶] ماخذ سابق، ص: ۲۵۳-۲۵۴۔

وو قایہ) ملت اسلامیہ ہند کی دینی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اور آیندہ دینیاتی علوم میں مہارت و تبحر پیدا کرنے کے لیے کافی ہے؟ مولانا گیلانی نے اس سوال کا بہت ہی تفصیل سے جواب دیا ہے اور ماضی کے ہندوستانی علماء کے درمیان سے ایسے شواہد پیش کیے ہیں جنہوں نے اسی مختصر دینیاتی نصاب کی تعلیم کے باوجود مختلف شعبہ ہائے زندگی میں نام اور کمال پیدا کیا۔ یہاں تک کہ خالص دینی علوم میں بھی ملک و بیرون ملک اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔[۱۷] ان کا ماننا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے دینی و دنیوی تعلیم کی دوئی کو تسلیم کر کے ایک بڑی غلطی کی، اگر وہ ایسا نہیں کرتے اور ماضی کی طرح جدید حالات اور تقاضوں کے مطابق نصاب تعلیم میں بتدریج ضروری تبدیلیوں کو بروئے کار لایا جاتا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ مسلمان نہ صرف یہ کہ نظام تعلیم کی وحدت کو بچا لے جاتے بلکہ نظام تعلیم کی ثنویت کے نقصانات سے بھی بچ جاتے۔ لکھتے ہیں:

> واقعہ یہ ہے کہ اگر دینی تعلیم کے نظام کو دنیوی تعلیم کے اداروں سے الگ نہ کر دیا جاتا، تعلیم کی دنیا میں یہ ثنویت نہ پیدا ہوتی، بلکہ دینی عناصر کو باقی رکھتے ہوئے وہی فقہ، حدیث و تفسیر کی تین کتابوں کو قائم رکھتے ہوئے بتدریج عقلی اور ذہنی علوم میں اسی قسم کی تبدیلیوں سے کام لیا جاتا جس طرح مسلمان ہزار بارہ سو سال سے کام لے رہے تھے تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ تعلیم کا جو نظام ہندوستان میں جاری تھا، وہ تمام عصری ترمیموں کو علم کی تمام شاخوں میں جذب نہ کر لیتا۔[۱۸]

مولانا گیلانی اس سے بھی انکار کرتے ہیں کہ مسلم علماء نے جدید علوم یا انگریزی تعلیم کی حرمت کا کوئی فتویٰ دیا تھا، ان کے مطابق ایسا صرف عوام میں مشہور ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں شاہ عبد العزیز کو بلاوجہ متہم گردانا جاتا ہے، جبکہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ وہ اور مولانا عبد الحی فرنگی محلی دونوں جواز کا فتویٰ دیتے ہیں۔ ان کے مطابق اس زمانے کے علماء کا اصرار اس پر تھا کہ ان کی تعلیم کے نظام کو توڑا نہ جائے، اس کی قدر و قیمت نہ گھٹائی جائے، جو چیز دین یا دین کا حصہ نہیں تھی اس میں بھی وہ کسی قسم کی ترمیم کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں ایسا نہیں تھا۔[۱۹] مولانا گیلانی اس کے ذریعے یہ بتانا چاہتے ہیں

---

[۱۷] ماخذ سابق، ص: ۲۵۷۔۲۸۷۔

[۱۸] ماخذ سابق، ص: ۲۸۷۔۲۸۸۔

[۱۹] ماخذ سابق، ص: ۲۹۰۔

کہ مسلمانوں کو موجودہ نظام تعلیم سے دور رہنے کے بجائے ان امکانات کو تلاش کرنا چاہیے جو ان کی خالص دینی تعلیم کو جدید نظام تعلیم کا حصہ بنانے میں معاون ہوسکتے ہوں۔ اگر موجودہ حکومتی نظام تعلیم اس کے لیے تیار نہیں ہوتا تو خود مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے زیر انتظام تعلیمی اداروں کو اس طور پر منظم کریں کہ ان میں دین کی بنیادی تعلیم کے ساتھ رائج ضروری علوم کی تدریس بھی ممکن ہو۔

نتیجۂ بحث

مختلف سرکاری و غیر سرکاری اعداد و شمار اور ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق ہونے والے مطالعات سے واضح ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال کسی بھی سطح پر تشفی بخش نہیں ہے۔ تعلیم کے میدان میں ان کی پس ماندگی نے انھیں دیگر شعبہ ہائے زندگی میں بھی پیچھے کر دیا ہے۔ موجودہ دور میں مسلمانوں کی ترقی و بہبود اگر مقصود ہے تو ضروری ہے کہ ان کی تعلیم کی جانب خصوصی توجہ دی جائے۔ اس کے لیے اگر ایک طرف سرکاری اقدامات ضروری ہیں تو دوسری طرف، جب تک سرکاری اقدامات نہیں ہوتے، مسلمان ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے رہ سکتے، مسلمانوں کے لیے یہ لازمی ہوگیا ہے کہ وہ بحیثیت سماج مسلم معاشرے کی تعلیمی ترقی کے لیے نہ صرف غور و فکر کریں بلکہ موجود وسائل کے بہتر استعمال کا ایک جامع اور قابل عمل لائحۂ عمل بھی تیار کریں۔ اس ضمن میں ایک بہت ہی قابل عمل نسخہ مولانا مناظر احسن گیلانی کی وحدت نظام تعلیم سے متعلق تجویز پر عمل درآمد کا ہوسکتا ہے۔ کیونکہ اس میں مسلمانوں کو فوری طور پر علاحدہ تعلیمی ادارے نہیں بنانے ہیں بلکہ پہلے سے موجود تعلیمی اداروں کی افادیت کو فزوں تر کرنے کے لیے اقدامات کرنے ہیں اور یہ اقدامات ایسے ہیں جنھیں معمولی جد وجہد سے عملی جامہ پہنایا جاسکتا ہے۔ اب شاید یہ فیصلہ لینے کا وقت بھی آگیا ہے کہ دینی و دنیوی تعلیم کی تفریق کو ختم کر دیا جائے اور مولانا گیلانی کے اس مشورے کو مان لیا جائے:

> دینیات کی عمومی تعلیم کے لیے جب تین یا زیادہ سے زیادہ چار کتابوں کا پڑھ لینا کافی خیال کیا گیا تھا اور زیادہ وقت غیر دینی علوم ہی کی تعلیم میں صرف ہوتا تھا تو آج بھی کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ غیر دینی علوم کے اس حصے کو جس کے اکثر نظریات و مسائل مسترد ہوچکے ہیں، کم از کم دنیا میں

ان کی مانگ باقی نہیں رہی ہے، ان کو نکال کر عصر جدید کے مقبولہ علوم اور عہد حاضر کی دفتری زبان انگریزی کے نصاب کو قبول کر کے مذہب کی تعلیم کو انہی تین کتابوں کے معیار کے مطابق باقی رکھتے ہوئے دینی و دنیاوی (تعلیم) کے مدارس کی اس تفریق کو ختم کر دیا جائے۔ [۲۰]

ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی بہتری کے لیے سرکاری اقدامات اس لیے ضروری ہیں کہ اس طرح صرف مسلمانوں کی ترقی نہیں ہوگی بلکہ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے ناگزیر ہے، ان کی ترقی کے ساتھ ملک بھی ترقی کرے گا۔ اگر ہمارے ملک کو صحیح معنوں میں عالمی سطح پر قائدانہ رول ادا کرنا ہے تو اس کے لیے پورے ملک کو ایک ساتھ اور مل کر ترقی کرنا ہوگا، کسی ایک طبقے یا بعض طبقات کا پیچھے رہ جانا خاص طور پر جب وہ ملک کی آبادی کا قابل ذکر حصہ بھی ہو، ملک کی ترقی و خوش حالی اور عالمی قیادت کے خواب کو کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دے گا۔ ملک کی مسلم اقلیت کے لیے ضروری ہے کہ اسے حاشیے پر رکھنے کے بجائے سبھی شعبہ ہائے زندگی میں عمومی سماجی دھارے کا حصہ بنایا جائے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کو پسماندہ رکھ کر نہ تو معاشی ترقی کے نشانے تک پہنچا جا سکتا ہے اور نہ ہی سماجی استحکام حاصل ہو سکتا ہے۔ مزید برآں ملک کے آئین میں سماجی انصاف، مساوات اور یکساں مواقع کی فراہمی کے جو اصول دیے گئے ہیں، اگر مسلمان زندگی کے کسی بھی شعبے میں سرکاری امتیاز یا عدم توجہی کی وجہ سے پیچھے رہ جاتے ہیں تو یہ آئین کے ان اصولوں کی خلاف ورزی ہوگی۔ اگر ملک کی ہمہ گیر ترقی مطلوب ہے اور اسے واقعی دنیا میں قائدانہ کردار ادا کرنا ہے تو ضروری ہے کہ ملک کے مسلمانوں کی تعمیر و ترقی کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔ ایسے منظم اور باحوصلہ اقدامات کیے جائیں کہ کم از کم تعلیم کے میدان میں مسلمانوں کو ملک کے دیگر طبقات کے برابر لایا جا سکے۔ ابتدائی تعلیمی اداروں میں مسلم طلبہ کے اندراج سے لے کر اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں داخلوں تک ایسے انتظامات کیے جائیں کہ وہ نہ تو تعلیم سے محروم رہ جائیں اور نہ ہی زندگی کے دوسرے میدانوں میں کسی طبقے سے پیچھے رہیں۔

---

[۲۰] ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، جلد: دوم، ص:۷۔

شیخ نورالدین: کشمیری ثقافت کی تجدید اور اس کے وسیع اثرات

اشتیاق احمد وگے
ریسرچ اسکالر، سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر
ishtiyaq.wagay@gmail.com

کشمیر کی تاریخ میں چودھویں صدی کی بااثر شخصیت شیخ نورالدین نے روحانی پاکیزگی، اسلامی رسوم ورواج اور کشمیری زبان و ثقافت کو اپنی شاعری میں لاکر تقویت پہنچائی اور اپنی تعلیمات کو عوام تک پہنچایا۔ ان کی سادگی، انکساری اور عالمگیر بھائی چارے کے بنیادی اصولوں نے متنوع افراد کے درمیان ہم آہنگی اور مساوات کو فروغ دیا۔ مزید بر آں، انھوں نے امن، ماحولیاتی ذمہ داری اور فطرت کے ساتھ بقائے باہمی پر زور دیا۔ شیخ نورالدین کی تعلیمات نے کشمیری معاشرے پر گہرا اثر چھوڑا اور ادب، موسیقی اور فنکارانہ اظہار کو متاثر کیا۔ آج بھی ان کی وراثت لوگوں کو متأثر کر رہی ہے۔ اس تحقیق کا مقصد ان کی گراں قدر خدمات پر روشنی ڈالنا اور ماضی اور حال دونوں میں کشمیری معاشرے اور ثقافت پر ان کے دیرپا اثر و رسوخ کو اجاگر کرنا ہے۔ مزید بر آں، اس میں کشمیر میں ریشی نظام خانقاہی کے احیاء میں شیخ نورالدین کے مؤثر کردار کا جائزہ لیا گیا ہے اور کشمیری معاشرے اور ثقافت پر ان کی تعلیمات کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

تعارف: شیخ نور الدین، جنہیں ”شیخ العالَم“ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، وادی کشمیر کی مذہبی اور ثقافتی تاریخ میں ایک نمایاں شخصیت ہیں۔ وہ چودھویں صدی عیسوی میں ۱۳۷۸ء کے آس پاس جموں و کشمیر کے ضلع کولگام میں واقع گاؤں قیموہ میں پیدا ہوئے[۱]۔ ان کی شخصیت ریشی نظام خانقاہی کے احیاء اور قیام میں ان کی خدمات کی وجہ سے ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ ان کی تعلیمات اور کاوشوں نے وادی کے روحانی اور ثقافتی منظر نامے کو تشکیل دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

---

[۱] حسن کھویہامی، تاریخ حسن، ترجمہ: شریف حسین قاسمی، علی محمد اینڈ سنز، سرینگر، ۲۰۲۲، جلد ۳، ص: ۱۶۲-۱۶۱؛ محی الدین مسکین، تاریخ کبیر، ترجمہ: شمس الدین احمد، شیخ غلام محمد اینڈ سنز، سرینگر، ۲۰۱۵، ص: ۲۱۰۔

شیخ نورالدین نے کشمیری معاشرے میں روحانی پاکیزگی، اسلامی رسوم ورواج اور اسلامی تشخص کی ترویج کی اہمیت پر زور دیا۔ انھوں نے کشمیری زبان میں بے شمار اشعار لکھے جو آج بھی کشمیری لوگوں کو ہر دم ورد زبان ہیں۔ ان اشعار کو، جنہیں "شروک" (سنسکرت: شلوک[۲]) کے نام سے جانا جاتا ہے، کشمیری ادب کا شاہکار سمجھا جاتا ہے اور ان کی گہری روحانی بصیرت اور خدا سے محبت کی عکاسی کرتا ہے۔

شیخ نورالدین کے نقطۂ نظر کا ایک قابل ذکر پہلو یہ تھا کہ انہوں نے اپنی شاعری میں کشمیری زبان اور ثقافت کو شامل کیا۔ ایسا کرتے ہوئے انہوں نے اپنی تعلیمات کو عام لوگوں تک پہنچایا، اسلامی اصولوں کی ترویج میں سہولت فراہم کی اور عوام میں مذہبی عقیدت کو فروغ دیا۔ سادگی، انکساری اور عالمگیر بھائی چارے پر ان کا زور سماجی حدود سے بالاتر تھا۔ وہ متنوع پس منظر کے افراد کے درمیان مساوات اور اتحاد کی وکالت کرتے تھے۔

شیخ نورالدین نے اپنی روحانی تعلیمات کے علاوہ امن، ہم آہنگی اور ماحولیاتی ذمہ داری کو بھی فروغ دیا۔ انھوں نے فطرت کے ساتھ ہم آہنگی اور ماحولیات کے تئیں ذمہ داری کے احساس کو پروان چڑھانے کی اہمیت پر زور دیا۔ یہ اقدار کشمیری معاشرے میں گہرے طور پر گونجتی تھیں اور ثقافتی اظہار کے مختلف پہلوؤں بشمول ادب اور دیگر فنکارانہ شکلوں پر گہرے اثرات مرتب کرتی تھیں۔ شیخ نورالدین کی میراث آج بھی کشمیر کے لوگوں کو متاثر کر رہی ہے۔ ان کی محبت، بھائی چارہ اور روشن خیالی کی تعلیمات کو ادارہ جاتی اقدامات اور سرکاری اعتراف کے ذریعے منایا اور محفوظ کیا جاتا ہے۔ شیخ نورالدین کا پائیدار اثر کشمیر کے روحانی، ثقافتی اور سماجی ڈھانچے میں ان کی قابل ذکر خدمات کی عکاسی کرتا ہے اور وادی کی تاریخ پر ایک دیرپا نقوش چھوڑتا ہے۔

شیخ نورالدین کی تعلیمات اور روحانی اثر ورسوخ نے مذہبی اور سماجی حدود سے بالاتر ہو کر کشمیر میں ایک بڑی تعداد کو اپنی طرف راغب کیا۔ ان کا اتحاد اور محبت کا پیغام اب بھی لوگوں میں گونجتا ہے۔ ان کی درگاہیں خاص طور پر بڈگام ضلع کے چرار شریف قصبے میں واقع ہیں[۳]۔ ان کو وادی

---

[۲] یہ ریشیوں کے اشعار یا نظم ہیں لیکن خصوصی طور پر اس کا استعمال نند ریشی یا شیخ نورالدین کے اشعار کے لئے کیا جاتا ہے: کنسائز کشمیری ڈکشنری، ص: ۳۶۲۔

[۳] محی الدین مسکین، ص: ۲۲۸-۲۲۷۔

میں مسلمان اور ہندو دونوں اہم زیارت گاہوں کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ شیخ نورالدین کی میراث ان کی روحانی تعلیمات سے بالاتر ہے۔ انہیں کشمیر کی ثقافتی تاریخ میں ایک بااثر شخصیت کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔ ان کے اشعار نے، جو کشمیری لوک داستانوں، تصوف اور مذہبی علامتوں کے عناصر کا امتزاج ہیں، وادی کی ادبی روایات پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ ان کی وفات کے صدیوں بعد بھی ان کی تعلیمات اور سب کے لئے محبت کا جذبہ لوگوں کو ان کی طرف راغب کرتا ہے۔ شیخ نورالدین کی وراثت وادی کے ثقافتی اور مذہبی ڈھانچے کا ایک لازمی حصہ ہے۔

نورالدین کے دور کا سماجی و ثقافتی پس منظر: ان کے دور کے تاریخی اور ثقافتی ڈھانچے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ چودھویں صدی کے کشمیر کے وسیع تر منظر نامے کا جائزہ لیا جائے۔ شیخ نورالدین کے دور میں کشمیر ایک وادی تھی جو اپنے شاندار ثقافتی ورثے، قدرتی حسن اور وسطی ایشیا، فارس اور برصغیر پاک وہند کو ملانے والے اسٹریٹیجک محل وقوع کی وجہ سے مشہور تھی۔ اس میں موریہ، کشان، گپتا اور بعد میں مسلم حکمرانوں سمیت مختلف خاندانوں اور سلطنتوں کے سیاسی اور ثقافتی اثرات کی ایک طویل تاریخ تھی۔ چودھویں صدی کے کشمیر میں ایک پیچیدہ سیاسی صورتحال دیکھنے میں آئی۔ اس وقت شاہمیری خاندان (۱۳۳۹-۱۵۶۱عیسوی) کی حکمرانی تھی، جو ایک مسلم خاندان تھا جس کی بنیاد شاہ میر (۱۳۳۹-۱۳۴۲ عیسوی) نے رکھی تھی، جو سواد گیر (وادی سوات) [۴] سے آیا تھا۔ اس دور میں کشمیر بدھ مت اور ہندو روایات کا مرکز تھا۔ پچھلی صدیوں کے دوران بدھ مت کا نمایاں اثر تھا، لیکن آہستہ آہستہ اس کی مقبولیت میں کمی واقع ہوئی، جس سے ہندو مت کے احیاء اور شیومت کے ابھرنے کی راہ ہموار ہوئی [۵]۔

شیخ نورالدین تصوف کے پیروکار تھے، جس کے ذریعے نفس کا تزکیہ، اخلاق کا تصفیہ اور

[۴] محمد اعظم دیدمری، واقعات کشمیر، ترجمہ: شمس الدین احمد، جموں و کشمیر اسلامک ریسرچ سینٹر، سرینگر، ۲۰۱۹، ص:۴۹-۴۸؛ حیدر ملک، تاریخ کشمیر، ترجمہ: رضیہ بانو، بھاونا پرکاشن، دہلی، ۱۹۹۱، ص: ۳۸-۳۷؛ حسن کھوئیہامی، تاریخ حسن، ترجمہ: شریف حسین قاسمی، علی محمد اینڈ سنز، سرینگر، ۲۰۱۳، جلد ۲، ص:۱۶۴؛ بہارستان شاہی، ترجمہ کے۔این-پنڈت، فرما کے ایل ایم پرائیویٹ لمیٹڈ، کلکتہ، ۱۹۹۱، ص: ۱۶۔

[۵] کشمیری سوسائٹی میں شیومت کے لئے دیکھیں: جے سی چٹرجی، کشمیری شیوازم، پریمل پبلکیشنز، دہلی، ۲۰۲۲؛ بی این پنڈت، ہسٹری آف کشمیری شیوازم، اتپال پبلکیشنز، سرینگر، ۱۹۹۰؛ بی این پنڈت، اسپیکٹس آف کشمیر شیوازم، اتپال پبلکیشنز، سرینگر، ۱۹۷۷۔

ظاہر وباطن کی تعمیر ہوتی ہے۔ ان کی تعلیمات نے زندگی کے روحانی اور سماجی پہلوؤں کے امتزاج پر زور دیا۔ انہوں نے سادگی، عقیدت اور مادّہ پرستانہ کاموں کو مسترد کرنے کی وکالت کی۔ ان کی تعلیمات مذہبی حدود کو عبور کرتے ہوئے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو اپنی طرف راغب کرتی ہیں۔ شیخ نورالدین کے روحانی اور سماجی پیغام نے کشمیر میں مذہبی اور ثقافتی اصلاحات کی لہر دوڑادی۔ تاہم یہ بات قابل ذکر ہے کہ شیخ نورالدین کے دور میں کشمیر کا تاریخی سیاق وسباق چیلنجز سے خالی نہیں تھا۔ وادی کا سیاسی منظر نامہ اکثر ہنگامہ خیز ہوتا تھا، جس میں مختلف مقامی اور بیرونی حکمران اقتدار کے حصول کے لئے برسرپیکار رہتے جس سے وادی کا استحکام متاثر ہوتا تھا۔ کشمیر میں بھی مختلف مذہبی گروہوں کے درمیان فرقہ وارانہ کشیدگی دیکھی گئی اور شیخ نورالدین کی تعلیمات ان تنازعات کا جواب تھیں۔

نورالدین کی خدمات

ریشی نظام خانقاہ کا قیام: شیخ نورالدین کا ریشی تحریک میں تاریخی کردار اس کے مجدد اور بانی دونوں کے طور پر ظاہر ہوتا ہے کیونکہ انہوں نے کشمیری معاشرے میں اسلامی رسم و رواج، قوانین اور اسلامی شناخت کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ ان کی حقیقی کاوشوں کے ذریعے، مخلص افراد کا ایک گروہ ابھرا، جو دوسروں کو راستبازی کی طرف رہنمائی کرنے اور غیر اخلاقی کاموں میں مشغول ہونے کی حوصلہ شکنی کرنے کے لئے پرعزم تھا۔ نتیجۃً شیخ نورالدین کو ریشی آرڈر کے سرخیل کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے، جو ایک ممتاز صوفی نظام ہے جس نے روحانی پاکیزگی اور غیر متزلزل اعتقاد کی انتہائی اہمیت پر زور دیا ہے۔ اس نظام نے کشمیر میں ایک روحانی تحریک کے طور پر نمایاں اثر ورسوخ حاصل کیا، جس نے متنوع عقائد کے افراد کے مابین رواداری، محبت اور ہم آہنگی کے بقائے باہمی کو فروغ دیا۔

کشمیری زبان و ثقافت کا احیاء: شیخ نورالدین نے کشمیری زبان و ثقافت کی بحالی اور ترویج میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے روحانی شاعری کو استعمال کیا، جسے کشمیری زبان میں ”شروک“ یا ”شلوک“ کہا جاتا ہے۔ یہ ذریعہ عام لوگوں کے لئے ان افکار تک رسائی کو ممکن بناتا ہے۔ نتیجۃً کشمیریوں میں اسلام کی ترویج ان کی اپنی زبان کے ذریعے ہوئی کیونکہ نورالدین نے اسے اپنے

شاعرانہ کلام میں شامل کیا۔ اس پیش رفت کو "کاشُر قرآن" کے نام سے جانا جاتا ہے[۶]، جو کشمیری زبان میں قرآن کی پیشکش کو اجاگر کرتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کو اپنی مادری زبان میں پیش کرکے نورالدین نے نہ صرف عوام الناس میں تیزی سے مقبولیت حاصل کی بلکہ ان افکار کو زبانی حفظ کرنے میں بھی سہولت فراہم کی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات سے مزین ان نظموں نے مختلف ذرائع سے کشمیر میں اسلام کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا۔ ان میں میوزیکل بینڈز Damali Fakeer اور اسٹریٹ بینڈز Damali Maeti بھی شامل ہیں[۷]۔

سادگی اور انکساری پر زور: اسلام انکساری کو اللہ کے بندوں کی صفات قرار دیتا ہے۔ شیخ نورالدین نے بھی اپنی تعلیمات میں ان صفات کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت میں واضح طور پر اس کا ذکر فرمایا ہے: "اور رحمان کے بندے وہ ہیں جو زمین پر آہستگی اور نرمی کے ساتھ چلتے ہیں"[۸]۔

مذکورہ بالا قرآنی آیت کی بنیاد پر شیخ نورالدین نے معتدل طرز زندگی اختیار کرنے کی اہمیت پر زور دیا۔ انہوں نے مادّہ پرستانہ کاموں کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے وعظ و تبلیغ کے فریضے کو سرانجام دیا اور لوگوں پر زور دیا کہ وہ اپنے آپ کو دنیاوی شان و شوکت اور مال و دولت کی زیبائش سے دور رکھیں۔ ان کی تعلیمات کا محور ایک ایسی زندگی کا فروغ تھا جس میں دلی اطمینان، خلوص، قناعت اور ساتھ ہی انسانوں کی بے لوث خدمت شامل تھی۔ انہوں نے اپنے فلسفے کو بیان کرنے کے لئے مندرجہ ذیل الفاظ استعمال کیئے:

سہہ ہے آسی زے، شال زن پکی زے
شرعک سوتھ ژٹی ز نہ زانہہ

(آپ نے علم، ہنر یا تقویٰ میں قیادت، فضل اور کمال کی شان حاصل کرنی ہے، جس کی وجہ سے

---

[۶] Wani, Muhammad Ashraf. *Islam in Kashmir*. Srinagar: Oriental Publishing House, 2004, p.68.

[۷] Khan, Muhammad Ishaq. *Kashmir's Transition to Islam: The Role of Muslim Rishis*. Srinagar: Gulshan Books, 2005, p. 196.

[۸] القرآن، ۲۵:۶۳۔

آپ کو معاشرے میں باعزت مقام حاصل ہو جائے گا، یعنی کسی بھی حالت میں آپ نے شیر کی طاقت اور نمایاں مقام حاصل کرنا ہے۔ آپ کو رحم دل اور عاجز ہونا چاہئے اور کسی بھی حالت میں آپ کو اسلامی قانون کے ذریعہ عائد پابندیوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے)[۹]۔

عالمگیر اخوت: مساوات کے بارے میں قرآن کی تعلیمات پر روشنی ڈالتے ہوئے، جو اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مرد اور عورت سے پیدا کیا اور باہمی افہام وتفہیم کو فروغ دینے کے لئے متنوع قوموں اور قبائل کو قائم کیا[۱۰]، شیخ نورالدین نے عالمگیر بھائی چارے کے تصوّر پر بہت زور دیا اور افراد کے درمیان ان کی ذات، مسلک یا معاشرتی حیثیت سے قطع نظر اتحاد کی وکالت کی۔ چنانچہ انہوں نے کہا:

تم بیون بیون پاد کری آشن ۔ یخ، تُلہ کتُر تہ شین

تامتھ ترن ونی اُکے گوو ۔ یامتھ پییکھ آفتاپچ پرو

(یخ، آب منجمد اور برف کو خدا نے الگ الگ پیدا کیا لیکن جیسے ہی مشرق سے نکلنے والی سورج کی شعاعیں ان پر پڑتی ہیں تو یہ تینوں پگھل کر پانی میں بدل جاتے ہیں)[۱۱]۔

یہ انسانیت کی مشترکہ اصل کی نشاندہی کرتا ہے، کیونکہ تمام افراد ایک ہی بنیادی مادہ، یعنی زمین سے پیدا ہوئے ہیں، اور بالآخر ایک ہی تقدیر کا سامنا کرنے والے ہیں۔ شیخ نورالدین نے اپنے دور کے معاشرے میں رائج ذات پات پر مبنی نظام اور سماجی درجہ بندیوں پر شدید تنقید کی۔ انھوں نے مساوات اور انصاف کے اصولوں کی حمایت کی اور تمام افراد کے حقوق کی وکالت کی، چاہے ان کا سماجی پس منظر یا حیثیت کچھ بھی ہو۔ ان کی تعلیمات رکاوٹوں کو ختم کرنے اور سب کو ساتھ ملانے کی تاکید کرتی تھی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ رسم و رواج کے ساتھ ساتھ ذات پات اور "کول"[۱۲] نامی نظام کے سخت مخالف تھے۔ انہوں نے واضح کیا کہ:

---

[۹] غلام محمد شاد، کلام شیخ العالم، علی محمد اینڈ سنز، سرینگر، ۲۰۱۳، ص: ۳۴۹۔

[۱۰] القرآن، ۱۳:۴۹۔

[۱۱] اسد اللہ آفاقی، کلیات شیخ العالم، لائف فاؤنڈیشن، چرار شریف، بڈگام، کشمیر، ۲۰۰۸، ص: ۳۴۹۔

[۱۲] کول / کولا (انگریزی: Kaula) تنتر شکتی مت اور شیومت میں ایک مذہبی روایت ہے جس کی خصوصیت مخصوص رسومات اور علامتیت سے منسلک ہے جو شیو اور شکتی کی عبادت کا حصہ ہے۔ کولوں کے ضابطۂ اخلاق اور

کول مو لگی رنگن تہ سنگن

کول مو ہنگن لگہ نے آو

(آپ کے وجود کا مقصد لوگوں کے درمیان تقسیم اور انتشار پھیلانا نہیں ہے۔ یہ آپ کے لئے نہیں ہے کہ آپ فخر سے کسی خاص نسل یا نسل کی برتری کا دعویٰ کریں)(۱۳)۔

ایک اور شعر میں شیخ نورالدین نے اسلام کے مساواتی نقطۂ نظر کا پرچار کیا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ تمام افراد کا نسب آدم اور حوا سے ملتا ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ معاشرے کے اندر متنوع قبائل کی موجودگی کا مقصد افراد کے درمیان حقیقی تفاہم اور رابطے کو فروغ دینا ہے:

حضرت بابا آدم مولو امہ حوا تتی آوو

اد کتھ دپن ڈونب واتل تہ ژرولو

کولس ہم کول کیاہ ہیڈ وو

(آدم اور حوا سے ہی بنی نوع انسان آگے چلتی ہے۔ ایک آدمی کو ڈومبا، واتل یا سپاہی سے کیا چیز مختلف بناتی ہے جب تمام لوگ ایک ہی والدین کی اولاد ہیں؟ لہٰذا اگر سب کا تعلق ایک ہی نسل سے ہے تو وہ ایک دوسرے سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟)(۱۴)

امن اور ہم آہنگی کا فروغ: شیخ نورالدین کی تعلیمات نے امن، ہم آہنگی اور عالمگیر بھائی چارے کے اصولوں کو فروغ دینے پر نمایاں توجہ مرکوز کی۔ انہوں نے تنازعات کو حل کرنے کے لئے مکالمے اور افہام و تفہیم کی اہمیت پر زور دیا، جس کا حتمی مقصد افراد اور برادریوں کے اندر اور ان کے مابین اتحاد اور ہمدردی کے اجتماعی احساس کو فروغ دینا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی ایک نظم میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

اکسئے مالس تہ ماجہ ہندین کوہ تھاو تھکھ دوئی تہ نیائے

مسلمانن کیو ہندین کر بندن توشہ خدائے

رسومات کو کولاچار کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مزید جاننے کے لئے دیکھیں: Gavin Flood, *An Introduction to Hinduism,* Cambridge University Press, 1996, p. 166.

(۱۳) ماخذ سابق، ص: ۲۹۶۔

(۱۴) ماخذ سابق، ص: ۳۹۰۔ مزید دیکھیں: ص: ۱۲۵، ۹۴-۳۹۲۔

(مشترکہ نسل سے تعلق رکھنے والی اولاد کب مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان غیر میانہ روی برتے گی؟ ان پر اللہ کے فضل و کرم کی نعمتیں کب عطا ہوں گی؟)[۱۵]

یہ اشعار مسلمانوں اور ہندوؤں کے مشترکہ ورثے کی طرف اشارہ کرتے ہے، جس کی وجہ سے لوگوں کو تفرقہ انگیز ڈھانچوں سے بالاتر ہو کر غور و فکر کرنے کی ترغیب ملتی ہے۔ یہ ان برادریوں کے درمیان اتحاد اور ہم آہنگی کی دلی خواہش کا اظہار کرتے ہیں، جس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ دوہری سوچ کو ترک کرنے سے خدا کی رضا اور الٰہی نعمتوں کی وافر مقدار حاصل ہو گی۔

ماحولیاتی انتظام: شیخ نورالدین فطرت اور ماحولیات کی گہری تعریف کرتے تھے اور رہنمائی کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانیت کو قدرتی دنیا کے ساتھ متوازن اور پائیدار تعلقات برقرار رکھنے کی ذمہ داری سونپی ہے۔ قرآن مجید میں بھی اسی احساس کی بازگشت سنائی دیتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''پھر ہم نے تمھیں ان کے بعد زمین میں جانشین بنایا تاکہ ہم دیکھ سکیں کہ تم کیا کرو گے''[۱۶]۔

شیخ نورالدین نے تمام جانداروں کے باہمی تعلق کو تسلیم کرتے ہوئے زمین کے تئیں ایمانداری سے کام لینے کی اخلاقی ذمے داری پر زور دیا۔ ان کی تعلیمات کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ افراد قدرتی ماحول کے تحفظ اور بقا کی کوشش کرتے ہوئے فطرت کے ساتھ ہم آہنگی کے ساتھ مل جل کر رہیں۔ شیخ نورالدین نے اپنے پیروکاروں میں ماحولیات کے تئیں ایک گہری ذمہ داری کا احساس پیدا کیا۔ اس فلسفے کے ایک اہم اظہار کو ان کے مندرجہ ذیل شعر میں دیکھا جا سکتا ہے:

ان پوشہ تیلہ ییلہ ون پوشہ (خوراک کا انحصار جنگلات پر ہے)[۱۷]

جب سیاق و سباق میں جائزہ لیا جائے تو یہ بیان اس بنیادی تصور کو ظاہر کرتا ہے کہ خوراک اور جنگلات کے درمیان تعلق باہمی انحصار کا ہے، جس میں خوراک کی رزق اور پیداوار جنگلات کی موجودگی اور صحت پر بہت انحصار کرتی ہے۔ جنگلات زرعی پیداوار کے لئے ضروری ماحولیاتی عمل

---

[۱۵] ماخذ سابق، ص: ۴۳۰؛ ابو نعیم، کلیات شیخ العالم، شیخ عثمان اینڈ سنز، سرینگر، ۲۰۰۶، ص: ۴۱۸۔ شیخ نورالدین کی مذہبی رواداری پر دیکھیں: غلام نبی خیال، شیخ العالم سنز شاعری منز مذہبی رواداری، علمدار کشمیر، جی این خاکی اور آفاق عزیز، مرکز نور، یونیورسٹی آف کشمیر، سرینگر، ۲۰۲۱، ص: ۲۷۸-۲۸۴۔

[۱۶] القرآن، ۱۴:۱۰۔

[۱۷] آفاقی، ماخذ سابق، ص: ۴۴۸۔

کو آسان بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں[۱۸]۔ وہ مٹی کی زرخیزی، پانی کی دستیابی، آب وہوا کے ضابطے، اور حیاتیاتی تنوع کے تحفظ میں مددگار ہوتے ہیں۔ جنگلات نے تاریخی طور پر مختلف خوردنی وسائل فراہم کیے ہیں، جن میں پھل، میوے اور مشروم وغیرہ شامل ہیں، جو انسانی غذا کی تکمیل کرتے ہیں اور غذائی تنوع فراہم کرتے ہیں۔ مزید برآں، جنگلات ادویاتی پودوں اور دیگر جنگلاتی مصنوعات کے ذخائر کے طور پر کام کرتے ہیں، جو نہ صرف کھانا پکانے کی روایات میں مددگار ہیں بلکہ مقامی برادریوں کے ثقافتی رسم ورواج کو بھی کمال بخشتے ہیں۔ جنگلات کے ساتھ خوراک کے ماتحت تعلق کو تسلیم کرتے ہوئے ہر شخص کو جنگلاتی نظام کو محفوظ رکھنے میں اہم کردار ادا کرنا چاہئے۔ ایسا کرنا طویل مدتی غذائی تحفظ کو یقینی بنانے، ماحولیاتی توازن کو برقرار رکھنے اور انسانی معاشروں کی مجموعی فلاح وبہبود کو فروغ دینے کے لئے نہایت اہم ہے۔

اس سے نتیجہ یہ اخذ ہوتا ہے کہ شیخ نورالدین کی تعلیمات، ذمہ دارانہ ماحولیاتی انتظام کی وکالت، خوراک کی پیداوار اور ثقافتی ورثے کو برقرار رکھنے میں جنگلات کے لازمی کردار کو تسلیم کرتے ہوئے، پائیدار طریقوں کو اپنانے اور انسانی ضروریات اور قدرتی دنیا کے درمیان نازک توازن کو برقرار رکھنے پر زور دیتی ہیں۔

وراثت اور ثقافتی اثر ورسوخ: شیخ نورالدین کی تعلیمات نے کشمیر کے ثقافتی اور مذہبی منظر نامے پر ایک انمٹ اثر چھوڑا۔ شیخ نورالدین کے شاگردوں نے، جو ریشیوں کے نام سے مشہور ہوئے، آپ کی تعلیمات کو آگے بڑھایا اور تعلیم وتربیت اور روحانیت کے مراکز قائم کیے۔ اس ریشی آرڈر نے ادب، سماع اور فنون لطیفہ سمیت کشمیری ثقافت کے مختلف پہلوؤں کو تشکیل دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ آفاقی محبت، بھائی چارہ اور وسیع النظری کا ان کا پیغام موجودہ دور میں بھی لوگوں کو متاثر کر رہا ہے۔ وہ کشمیری تصوف اور مذہبی فکر کی تاریخ میں ایک نمایاں شخصیت کے طور پر قابل احترام ہیں کیونکہ انھوں نے وادی کے روحانی، ثقافتی اور معاشرتی فریم ورک پر ایک پائیدار اثر چھوڑا ہے۔

شیخ نورالدین کا اثر ورسوخ اتنا زیادہ تھا کہ اس نے افغان حکمران عطا محمد خان (۱۸۰۷-۱۸۱۳

---

[۱۸] جنگلات اور غذا کے باہمی انحصار پر مزید دیکھیں:

FAO, Food and Agricultural Organization of the United Nations, "Making Food for Forests and Food Security", *State of the World's Forests 2016,* 2016, pp. 54-85.

عیسوی) کو ۱۸۰۸-۱۸۱۰ عیسوی کے درمیان ان کے اعزاز میں سکے رائج کرنے پر راغب کیا[۱۹]۔
متعدد ادارہ جاتی اقدامات کے قیام کے ذریعے کشمیری معاشرے پر ان کے گہرے اثرات کا اعتراف کیا گیا ہے۔ اس کی ایک قابل ذکر مثال مرکز برائے شیخ العالم اسٹڈیز ہے جس کی بنیاد ۱۹۹۸ء میں کشمیر یونیورسٹی میں رکھی گئی[۲۰]۔ یہ مرکز شیخ نورالدین کی زندگی پر گہری تحقیق کرنے اور ان کی تعلیمات کو نوجوان نسل اور کشمیر کے وسیع تر معاشرے تک پہنچانے کے لئے وقف ہے۔ یہ ادارہ شیخ نورالدین کی تعلیمات کی گہرائی سے چھان بین کے لئے ایک پلیٹ فارم کے طور پر کام کرتے ہوئے عصر حاضر میں شیخ نورالدین کے پیغام کو روشن کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کی اہم خدمات کے اعتراف میں یونیورسٹی آف کشمیر نے ۲۰۱۵ء میں شیخ العالم چیئر قائم کیا[۲۱]۔ اس تحقیقی مرکز کا مقصد علمی کاوشوں کو آسان بنانے اور ان کی روحانی بصیرت اور ثقافتی خدمات کی گہری تفہیم کو فروغ دے کر ان کی وراثت کا احترام کرنا ہے۔

کشمیری معاشرے پر شیخ نورالدین کے غیر معمولی اثرات کو بڑے پیمانے پر تسلیم کیا گیا ہے، جس کا ثبوت ان کے اعزاز کے لئے متعدد اداروں کا قیام ہے۔ ان اداروں میں اسپتال، مساجد، مدرسے، کھیلوں کے اسٹیڈیم، ہوسٹل، اسکول اور کالج کے ساتھ ساتھ وادی کشمیر کے اندر پل اور کالونیاں شامل ہیں[۲۲]۔ مزید برآں، ایک اہم خراج تحسین پیش کرتے ہوئے، حکومت ہند نے

---

[۱۹] Sūfī, GMD. *Kashir: Being A History of Kashmir*. Lahore: The University of Panjab, 1949, p. 101.

[۲۰] Shaikh-Ul-Aalam Centre for Multidisciplinary Studies, University of Kashmir. 1988. 24 June 2023. http://markazinoor.uok.edu.in/Main/AboutUs.aspx

[۲۱] ماخذ سابق۔

[۲۲] ان میں سے قابل ذکر ادارے گاندربل اور بڈگام میں واقع دارالعلوم ہیں۔ مزید برآں، ان کی وراثت سے وابستہ اسکول اور کالج داشی پورہ، راہمو، ابہاما، چکورا، کولگام، آونیرا، واگورا، شانگس، کاوسا، پامپور، بڈگام اور دیگر مقامات پر پائے جاتے ہیں۔ شیخ نورالدین کے اعزاز میں مساجد بجبہاڑہ، سنگم، نیلو، چرارشریف، پامپور، پہلگام اور دیگر جگہوں پر تعمیر کی گئی ہیں۔ ان کے نام سے منسوب اسپتال نیواپلوامہ اور کرن نگر سرینگر میں کمیونٹی کی خدمت کرتے ہیں۔ ان کے نام کے کھیلوں کے اسٹیڈیم برازلو شوپیان، مونگہ ہال اننت ناگ اور کھی کولگام میں پائے جاتے ہیں۔ کولگام ضلع کے کاتروسو اور پاریگام ٹپل، ان کی یاد میں وقف کیے گئے ہیں۔ متعدد کالونیوں کے نام شیخ نورالدین کے نام پر رکھے گئے ہیں، جن میں چرارشریف، چاڈورہ، نوگام، سورہ اور سری نگر شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے اعزاز میں منسوب ہوسٹل چرارشریف اور حضرت بل میں واقع ہیں۔

۲۰۰۵ء میں سرینگر ہوائی اڈے کا نام تبدیل کر کے شیخ العالم بین الاقوامی ہوائی اڈہ رکھ دیا، اور اسے بین الاقوامی درجہ دیا[۲۳]۔ ان ادارہ جاتی اقدامات اور سرکاری اعتراف کے ذریعے شیخ نورالدین کی تعلیمات اور خدمات کو سراہا اور محفوظ کیا جارہا ہے تاکہ کشمیری معاشرے پر ان کے گہرے اثرات کو موجودہ اور آنے والی نسلیں تعظیم و تسلیم کرتی رہیں۔

کشمیری ادب اور فنون لطیفہ پر نورالدین کا اثر: شیخ نورالدین کی تعلیمات نے وادی کشمیر کی ثقافت اور فنکارانہ اظہار پر گہرا اثر ڈالا۔ تصوف کے اصولوں کو کشمیر کی پہلے سے موجود روحانی اور ثقافتی روایات کے ساتھ یکجا کر کے ان کی تعلیمات نے وادی کے اندر ایک پائیدار وراثت قائم کی ہے۔ ان کے اثرات کی وسعت کو مکمل طور پر سمجھنے کے لئے، کشمیری شاعری، موسیقی اور دیگر فنکارانہ مظاہر کے دائروں میں جھانکنا ضروری ہے۔

کشمیری شاعری: کشمیری شاعری کا دائرہ شیخ نورالدین کی تعلیمات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ انہوں نے اپنے صوفیانہ تجربات اور روحانی بصیرت کا اظہار کشمیری زبان میں لکھی گئی شاعری کے ذریعے کیا جو عام لوگوں کے لیے قابل رسائی تھی۔ ان کی شاعری نے، جسے ''شیخ شروک'' کے نام سے جانا جاتا ہے، گہری روحانی سچائیوں کو سادہ اور عام فہم زبان میں بیان کیا۔ شیخ نورالدین کی شاعری میں محبت الٰہی، انسانی وجود اور خودشناسی کی جستجو کے موضوعات کا احاطہ کیا گیا اور کشمیر کی ادبی روایات کو مزید عروج دیا۔ ان کے شاعرانہ انداز اور پیغام نے کشمیری عوام کو متاثر کیا اور ان کی شاعری ان کی پیروی کرنے والے شاعروں کے لئے ایک تحریک بن گئی۔ ان کی گہری روحانی بصیرت اور انسانیت نے وادی کے بے شمار شاعروں کو متاثر کیا ہے۔ ان کشمیری شاعروں میں حبہ خاتون (۱۵۵۴-۱۶۰۹ عیسوی)، روپہ بھوانی (۱۶۲۱-۱۷۲۱عیسوی)، سوچھ کرال (۱۷۸۲- ۱۸۵۴ عیسوی)، شمس فقیر (۱۸۴۳-۱۹۰۱عیسوی) اور احد زرگر (۱۸۸۲-۱۹۸۴عیسوی) شامل ہیں۔

روحانی نظمیں اور ترانے: شیخ نورالدین کی تعلیمات کا اثر سماع کے دائرے میں بھی گونجتا ہے۔ روایتی کشمیری سماع کی شکلوں کے ساتھ صوفی عناصر کے امتزاج نے ایک منفرد سماع کی روایت کو جنم

---

[۲۳] Dean Accardi, "Embedded Mystics: Writing Lal Ded and Nund Rishi into the Kashmiri Landscape" in *Kashmir: History, Politics, Representation*, ed. Chitralekha Zutshi, Cambridge University Press, New York, 2020, p. 247.

دیاہے جو روحانیت کے تبحرّ اور ثقافتی ورثے دونوں کا احاطہ کرتی ہے۔ ان کی تعلیمات سے متاثر ہونے والی نظمیں اور ترانے نہ صرف سننے والوں کے حوصلے بلند کرتے ہیں بلکہ خدا سے رابطہ قائم کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

ان کی روحانی تعلیمات کا اظہار روحانی شاعری کی شکل میں ہوا، جسے ''ونہ وُن'' یا ''صوفیانہ کلام'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ونہ وُن کلاسیکی کشمیری شاعری، صوفی شاعری اور صوفیانہ موضوعات کا ایک انوکھا امتزاج ہے[۲۴]۔ اس روایت میں لکھے گئے ترانوں کی ایک خوبصورت اور جذباتی انداز میں سماعت کی جاتی ہے۔ یہ ترانے محبت الٰہی کا جشن مناتے ہیں اور روحانی تعلق اور عقیدت کے ذریعے کے طور پر کام کرتے ہیں۔ خدا کی محبت کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

عاشق سُے یُس عشقہ ستی دزی　　سون زن پرزلس پنُن پان
عشقہ دود یس ہامالہ وانجہ سزی　　سُے اد واتی لا مکان

(ایک مخلص عاشق محبت اور جذبے میں غرق ہو جائے گا، سونے کی طرح چمک دمک کے ساتھ تابکاری ہو گی۔ جو لوگ محبت کے جوش و جذبے اور آرزو کے تیروں سے چھنتے ہیں، وہی خود کو دور اندیش منزلوں کے حقیقی دائروں میں رہتے ہوئے پائیں گے)[۲۵]

وہ لکھتے ہیں کہ محبت الٰہی، اپنی غیر متزلزل قوت کے ساتھ، لوگوں کو مشکلات اور قربانیوں کے ساتھ ثابت قدم رہنے کی طرف راغب کرتی ہے اور انہیں شدید نقصان کے دوران بھی بغیر کسی ہچکچاہٹ کے آگے بڑھاتی ہے:

عشق چھُئے کُن شُر ماجہ مرُن　　سُہ مرتھ اوہر کر تہ پکھ
عشق چھُئے کنڈی زنڈ وتھرُن　　وتھرتھ ڈُلاہ کر تہ پکھ
عشق چھُئے گُنہ تُلہ ریو بی برُن　　سُہ سُکھ دماہ بر تہ پکھ
عشق چھُئے کرتلہ سر دارُن　　سُہ دارتھ یہ تہ پکھ

---

[۲۴] وژُن کو ''کہاوت'' کہا جاتا ہے اور یہ ایک مخصوص شعری صنف ہے جس میں ہر چوکور (چار سطروں پر مشتمل بند) میں بار بار گایا جاتا ہے۔ کاشر لغات کے مطابق، یہ ایک گانا ہے، جس میں جذباتی اظہار کے ساتھ آواز کی موسیقی بھی ہوتی ہے۔ ان دونوں تعریفوں کو تفصیلات سے جاننے کے لئے دیکھیں: کنسائز کشمیری ڈکشنری، ص: ۵۷۹؛ شفیع شوق، کاشر لغات: اے ڈکشنری آف کشمیری لنگویج، علی محمد اینڈ سنز، سرینگر، ۲۰۱۸، ص: ۱۱۶۴۔

[۲۵] ماخذ سابق، ص: ۳۴۵۔

عشق چھئے غنیمس بُتھ نیرُن سُہ پھیرتھ یہ تہ پکھ
عشق چُھئے رتہ جامہ بدن پارُن سُہ رخت گنڈتھ یہ تہ پکھ

(محبت ایسی ہوتی ہے کہ جب ایک ماں کا اکلوتا بیٹا فوت ہو جائے اور وہ اس کے بارے میں سوچنا بھی چھوڑے اور اپنا سفر جاری رکھے۔ محبت کانٹے کے بستر کی طرح ہے اور آپ کو اس پر لیٹ جانا ہے اور سوئے منزل چلتے رہنا ہے۔ محبت اپنی گود میں شہد کی مکھیوں کو بھرنے کا نام ہے۔ سو وہ لمحہ برداشت کرنا ہے اور چلتے رہنا ہے۔ محبت ننگی تلوار کے نیچے سر رکھنے کا نام ہے۔ اپنا سر تلوار کے سامنے پیش کرتے جاؤ اور اپنا سفر جاری رکھو۔ محبت آپ کو جنگ میں فرنٹ لائن سپاہی بناتی ہے۔ اس صورت حال سے پیچھے نہ ہٹو اور آگے بڑھو۔ محبت شہید کا خون آلود لباس پہنے ہوئے چلنے کا نام ہے۔ سو وہ پہن کے رکھو اور اپنی منزل کی طرف گامزن ہوتے جاؤ)۔[۲۶]

فن اور خطاطی: شیخ نورالدین کا اثر شاعری اور سماع کے دائروں کے باہر بھی ہوا ہے۔ بصری فنون بشمول خطاطی، منی ایچر پینٹنگز (Miniature paintings) اور آرکیٹیکچرل ڈیزائن (Architectural design)۔ ان کی تعلیمات کے ناقابل فراموش نشان رکھتے ہیں۔ روحانیت اور جمالیات کی آمیزش پر ان کے زور نے کشمیری کاریگروں کی فنکارانہ حساسیت پر گہرا اثر ڈالا، جس نے بصری اور روحانی طور پر متاثر کن شاہکاروں کو جنم دیا۔

شیخ نورالدین کی روحانی بصیرت اور اشعار کے گہرے اثر کے تحت فنکاروں کو مصوری اور خطاطی کی تخلیق کی ترغیب ملی جس میں ان کی تعلیمات اور صوفیانہ تجربات کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا۔ یہ فنکارانہ تاثرات اکثر اسلامی خطاطی کے عناصر کو روایتی کشمیری نمونوں کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں، جس سے بصری طور پر دلکش فن پارے تخلیق ہوتے ہیں۔ معاصر کشمیری آرٹ میں بھی فن اور خطاطی پر شیخ نورالدین کی تعلیمات کا اثر واضح ہے کیونکہ فنکار ان کی گہری دانش مندی سے ترغیب حاصل کرتے ہوئے ایسے فن پارے تخلیق کرتے ہیں جو وادی کے ثقافتی اور روحانی ورثے کی عکاسی کرتے ہیں۔ بہر حال شیخ نورالدین کی تعلیمات کشمیر کے ثقافتی اور فنی منظر نامے پر اپنے

---

[۲۶] ماخذ سابق، ص:۳۴۱، ۳۴۵، ۳۴۶۔ نورالدین کے محبت الٰہی کو تفصیلات سے جاننے کے لئے دیکھیں: مرزا محمد زماں آزردہ، "شیخ العالم کا تصور عشق"، حضرت شیخ العالم، جلد ا، جی این خاکی اور آفاق عزیز، مرکز نور، یونیورسٹی آف کشمیر، سرینگر، ۲۰۲۱، ص:۲۰۰-۲۱۰۔

انمٹ نشان چھوڑے ہیں۔ کشمیری شاعری، سماع اور مختلف فنی شکلوں پر ان کے اثرات اور ان کی تعلیمات کی گہری گونج، وادی کے تخلیقی اظہار میں ان کی پائیدار وراثت کا ثبوت ہے۔

ثقافتی شناخت اور میراث: مخصوص فن پاروں سے ہٹ کر شیخ نورالدین کی تعلیمات نے کشمیر کی ثقافتی شناخت اور ورثے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ مساوات، اتحاد، رواداری اور ہمدردی پر ان کا زور آج بھی کشمیر میں گونجتا ہے، جس سے اجتماعی شناخت کے احساس اور ان کی ثقافتی جڑوں سے گہرا تعلق پیدا ہوتا ہے۔ ان تعلیمات نے کشمیری زبان، ادب، موسیقی اور دیگر فنی شکلوں کے تحفظ اور فروغ کی رہنمائی کی اور ثقافتی شناخت کو اپنانے اور تنوع کے جشن کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ شیخ نورالدین کی آبائی دانش مندی اور روایات کے خاتمے پر زور دینے سے کشمیری ثقافتی روایات کی لچک اور تسلسل میں مدد ملی ہے۔

کشمیر کی تاریخ پر شیخ نورالدین نے اپنی تعلیمات کے ذریعے ریشی نظام خانقاہی کی تجدید کی اور وادی کے روحانی اور ثقافتی منظر نامے پر ایک انمٹ نشان چھوڑا۔ روحانی پاکیزگی، اسلامی رسم ورواج اور کشمیری زبان اور ثقافت کے انضمام پر ان کے زور نے ان کی تعلیمات کو عوام کے لئے قابل رسائی بنادیا۔ شیخ نورالدین کا سادگی، انکساری اور عالمگیر بھائی چارے کا پیغام معاشرتی تقسیم سے بالاتر ہو کر مختلف پس منظر کے لوگوں میں مساوات اور اتحاد کے احساس کو فروغ دیتا ہے۔ ان کی تعلیمات کشمیر کے لوگوں میں اب بھی محبت، ہمدردی اور اندرونی روشن خیالی کو فروغ دے رہی ہیں۔ مزید برآں، شیخ نورالدین کی امن، ہم آہنگی اور ماحولیاتی تحفظ کی وکالت نے فطرت کے ساتھ ہم آہنگی سے زندگی گزارنے کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ ان کی تعلیمات نے کشمیر کے مختلف ثقافتی اظہارات پر گہرا اثر ڈالا ہے، ماحول کے تئیں ذمہ داری کے احساس کو فروغ دیا ہے اور فنکارانہ اختتام کی ترغیب دی ہے۔

آج شیخ نورالدین کی میراث زندہ ہے اور ادارہ جاتی اقدامات اور سرکاری اعتراف کے ذریعے محفوظ بھی ہے۔ کشمیر کے روحانی، ثقافتی اور سماجی تانے بانے میں ان کی خدمات نے وادی کی تاریخ کو تشکیل دینے اور نسلوں کو متاثر کرنے کے لئے دیرپا نقوش چھوڑے ہیں۔ روحانی روشن خیالی، ثقافتی انضمام، اور ماحولیاتی سرپرستی پر ان کا زور، اندرونی امن اور ہم آہنگی کی تلاش میں افراد کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی جاری رکھے ہوئے ہے۔ شیخ نورالدین کی وراثت امید کی کرن کے طور پر

کام کرتی ہے، محبت، اتحاد اور کشمیر کے امیر ورثے سے گہرے تعلق کو فروغ دیتی ہے۔

کتابیات

۱۔ اسد اللہ آفاقی، کلیات شیخ العالم، چرار شریف، لائف فاؤنڈیشن، ۲۰۰۸۔

۲۔ مرزا میر محمد زمان آزردہ، "شیخ العالم کا تصور عشق"۔ حضرت شیخ العالم، تالیف: جی این خاکی اور آفاق عزیز، جلد ۱، مرکز نور، یونیورسٹی آف کشمیر، سرینگر، ۲۰۲۱۔

۳۔ محمد فاروق بخاری، کشمیر میں اسلام: منظر اور پس منظر، مکتبہ علم وادب، سرینگر، ۲۰۱۳۔

۴۔ محمد اعظم دیدمری، واقعات کشمیر، ترجمہ: شمس الدین احمد، جموں اینڈ کشمیر اسلامک ریسرچ سنٹر، سرینگر، ۲۰۱۹۔

۵۔ غلام نبی خیال، "شیخ العالم سنز شاعی منز مذہبی رواداری"۔ علمدار کشمیر، تالیف: جی این خاکی اور آفاق عزیز، مرکز نور، یونیورسٹی آف کشمیر، سرینگر، ۲۰۲۱۔

۶۔ حسن کھوئیہامی، تاریخ حسن، جلد ۲، ترجمہ: شریف حسین قاسمی، علی محمد اینڈ سنز، سرینگر، ۲۰۱۳۔

۷۔ حسن کھوئیہامی، تاریخ حسن، جلد ۲۔ ترجمہ: شریف حسین قاسمی، علی محمد اینڈ سنز، سرینگر، ۲۰۲۲۔

۸۔ محی الدین مسکین، تاریخ کبیر، ترجمہ: شمس الدین احمد، شیخ محمد عثمان اینڈ سنز، سرینگر، ۲۰۱۵۔

۹۔ ابو نعیم، کلام شیخ العالم، شیخ محمد عثمان اینڈ سنز، سرینگر، ۲۰۰۶۔

۱۰۔ جی ایم شاد، کلام شیخ العالم، علی محمد اینڈ سنز، سرینگر، ۲۰۱۳۔

11. ʻAlī, Sayyid, *Tārīkh-i Kashmīr*. Trans. A.Q. Rafiqi. Srinagar: Gulshan Books, 2011.

12. Accardi, Dean, "Embedded Mystics: Writing Lal Ded and Nund Rishi into the Kashmiri Landscape." Zutshi, Chitralekha. *Kashmir: History, Politics, Representation*. New York: Cambridge University Press, 2020.

13. Anonymous, *Bahāristān-i Shāhī*. Trans. K.N. Pandit. Calcutta: Firma KLM Pvt. Ltd., 1991.

14. Chatterji, J.C., *Kashmir Śaivism*. Delhi: Parimal Publications, 2022.

15. "Concise Kashmiri Dictionary." Ed. Zaffar Muzaffar. Srinagar: Jammu & Kashmir Academy of Art, Culture & Languages, 2006.

16. FAO, Food and Agricultural Organization of the United Nations. "Making Food for Forests and Food Security." *State of the World's Forests 2016,* 2016.

17. Khan, Muhammad Ishaq, *Kashmir's Transition to Islam: The Role of Muslim Rishis*. Srinagar: Gulshan Books, 2005.

18. Malik, Haidar, *Tārīkh-i Kashmīr*. Tr. Razia Bano. Delhi: Bhavna Prakashan, 1991.

19. Pandit, B.N., *Aspects of Kashmir Shaivism*. Srinagar: Utpal Publications, 1977.

20. —. *History of Kashmir Shaivism*. Srinagar: Utpal Publications, 1990.

21. Shaikh-Ul-Aalam Centre for Multidisciplinary Studies, University of Kashmir. 1988. 24 June 2023.
<http://markazinoor.uok.edu.in/Main/AboutUs.aspx>.

22. Shawq, Shafī, *Kashir Lughāt: A Dictionary of Kashmiri Language*. Srinagar: Ali Mohammad & Sons, 2018.

23. Sūfī, GMD, *Kashir: Being A History of Kashmir*. Lahore: The University of Panjab, 1949.

24. Wani, Muhammad Ashraf, *Islam in Kashmir*. Srinagar: Oriental Publishing House, 2004.

اسلامی دینار کی ولادت

محمد سناجلہ

اموی خلیفہ عبد الملک مروان کے زمانے میں یہ سونے کا دینار ۶۹۷۔۶۹۸ ء میں ڈھالا گیا

سکّے (مسکوکات) انسانی ایجادات میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کی وجہ سے تہذیب کی ترقی ہوئی اور مختلف قوموں کے درمیان منافع بخش تبادلہ شروع ہوا۔ سکّہ کسی بھی قوم کی ثقافتی اور اقتصادی تاریخ میں ایک اہم مرحلہ ہوتا ہے۔ کسی قوم کا اپنا سکہ ہونا اس کی قوت اور دوسری قوموں کے مقابلے میں اس کے تہذیبی اور ثقافتی امتیاز کا نشان ہے۔ سکوں پر پائی جانے والی عبارتیں اور اشکال کسی قوم یا حکومت کی ثقافت کا اظہار ہوتی ہیں۔

عرب علاقے سکوں کے مختلف عصور سے گذرے ہیں۔ یہاں پہلے سامان کا سامان سے تبادلہ (مقایضۃ) ہوتا تھا، پھر معدنی سکے وجود میں آئے اور آج کاغذ کے نوٹ رائج ہیں۔ اسلام کے ظاہر ہونے کے ساتھ اس علاقے کے سکوں کی شکل اور قیمت میں بڑی تبدیلی آئی۔ عصر اسلام میں جاری ہونے والے سکے نہ صرف عرب اسلامی شخصیت کے غماز تھے بلکہ اسلام کے تحت قائم ہونے والے اقتصادی اور تہذیبی نظام کی قدروں کو بھی واضح کرتے تھے۔

قدیم زمانے سے جزیرۂ عرب ایک ممتاز حیثیت کا حامل تھا۔ عالمی تجارت کے مختلف راستے اس کے علاقوں سے گذرتے تھے۔ مکہ مکرمہ ایک اہم تجارتی مرکز تھا جس کا متعدد ملکوں اور تہذیبوں سے

لین دین تھا جیسے بیزنطی (رومی) اور فارسی تہذیبیں۔ اس لین دین کی وجہ سے عرب ان ملکوں کے سکوں سے واقف تھے اور خود اپنے سکے ڈھالنے سے پہلے ان ملکوں کے سکوں کو استعمال کرتے تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ متعدد قدیم عرب حکومتوں نے بھی اپنے سکے ڈھالے جیسے یمن کی مملکۃ سباً اور حضر موت، اور اردن کی نبطی حکومت، جیسا کہ اردن کی جامعہ یرموک کے اسکالر عبد الحق العیفۃ نے اپنی تحقیق ”اسلامی تاریخ میں سکوں کی ترقی“ میں بتایا ہے۔

بیزنطی اور فارسی سلطنتیں بالترتیب بیزنطی دینار اور کسروی درہم استعمال کرتی تھیں اور یہ دونوں سکے جزیرۂ عرب میں قبل اسلام رائج تھے۔ یہ سلسلہ اموی حکومت تک چلا جیسا کہ منصور زارا نجاد نے اپنی تحقیق ”اسلامی سکوں اور درہم و دینار کی پہچان“ میں بتایا ہے جو ریسرچ گیٹ پر دستیاب ہے۔

بیزنطی دینار: بیزنطی سلطنت نے سولیدوس Solidus یا نومیسما Nomisma نامی سونے کا سکہ جاری کیا جسے بیزنطی دینار بھی کہا جاتا ہے۔ یہ سکہ بڑے تجارتی معاملات اور ٹیکس کی ادائیگی کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ انطاکیہ اور اسکندریہ کی سکہ بنانے والی فیکٹریاں جنوبی علاقے کی اکثر ضروریات کو پورا کرتی تھیں۔ اسلامی حکومت کو اپنے شروع کے زمانے میں سکّوں کا یہی نظام ملا۔ اس نے اس نظام کو تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ استعمال کیا۔

بیزنطی سکہ سونے کا ہوتا تھا اور اس کے سامنے والے حصے میں تین شہنشاہوں کی تصویر ہوتی تھی۔ بیچ میں ہرقل ہوتا تھا اور اس کے دائیں بائیں اس کے بیٹے قسطنطین اور ہراکلیون ہوتے تھے۔ یہ سب صلیب لگے ہوئے تاج پہنتے تھے اور ہر ایک کے ہاتھ میں چھوٹی سی گیند ہوتی تھی جس پر صلیب بنی ہوتی تھی۔ یہ سکے بہت اعلیٰ درجے کے ہوتے تھے اور ان پر یونانی زبان میں کچھ لکھا ہوتا تھا۔ اس کا قیاسی وزن 4,33 گرام ہوتا تھا، جیسا کہ ڈاکٹر وجدان علی نے ”التراث الاسلامی“ کے پورٹل پر اپنی تحقیق میں بتایا ہے۔

کسریٰ کے فارسی درہم: یہ چاندی کا ہوتا تھا اور اسے کسروی سکہ کہا جاتا تھا۔ اس کے ایک طرف کسریٰ کی تصویر ہوتی تھی اور دوسری طرف ایرانیوں کے نزدیک مقدس آگ کا نقش ہوتا تھا۔

قدیم زمانے میں کئی طرح کے درہم چلتے تھے۔ ان میں سب سے اہم طبری درہم تھا جس کا

وزن ۴/ دانق [۱] تھا۔ دانق ایک اسلامی تول کا معیار تھا جس کا استعمال اسلامی عہد میں ہوتا تھا۔ ایک دانق کا وزن ایک درہم کا چھٹا حصہ ہوتا تھا، جیسا کہ اسکالر عبد الحق العیفۃ نے اپنی تحقیق میں بتایا ہے۔

محققین نے بتایا ہے کہ نبی اکرمؐ اور خلیفۂ اول حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں اسلامی حکومت کا اپنا سکہ کوئی نہیں تھا۔ سکہ ڈھالنے کی پہلی کوشش خلیفہ عمر بن الخطابؓ کے زمانے میں ہوئی کیونکہ انھوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ سکہ صرف ایک اقتصادی وسیلہ نہیں ہے بلکہ وہ کسی حکومت کی شخصیت کا مظہر بھی ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں کسریٰ کے درہموں جیسے درہم ڈھالے گئے لیکن ان پر ''الحمد للہ'' اور ''محمد رسول اللہ'' لکھا ہوتا تھا۔ اسی طرح حضرت عثمانؓ کے زمانے میں طبرستان میں درہم ڈھالے گئے اور ان پر کوفی رسم الخط میں ''بسم اللہ ربّی'' لکھا ہوتا تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانے میں بصرہ میں سکے ڈھالے گئے لیکن ان میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ البتہ اموی دور میں سکوں کے نظام میں بڑی تبدیلی آئی جیسا کہ محمد العناسوۃ نے اپنی تحقیق ''المسکوکات مصادر وثائقیہ للمعلومات في التاریخ الإسلامي'' میں کہا ہے۔ اموی عہد میں اسلامی دینار کا ڈھالا جانا صرف ایک اقتصادی عمل نہیں تھا بلکہ اسلامی حکومت کی سیاسی اور ثقافتی آزادی کا بھی اعلان تھا جس کی وجہ سے اسلامی حکومت کا ٹکراؤ بیزنطی شہنشاہیت سے ہوا۔

عبد الملک بن مروان کو جنگوں کے دوران بیزنطی شہنشاہ سے صلح کرنا پڑی تھی اور صلح کی شرطوں میں ہر ہفتے ایک ہزار دینار خراج دینا شامل تھا تاکہ بیزنطینی شام کی سرحدوں پر حملہ نہ کریں۔ جب عبد الملک بن مروان نے اپنا دینار ڈھالنے کا فیصلہ کیا تو شہنشاہ جستینیان ناراض ہوگیا اور اس نے دھمکی دی کہ اگر عبد الملک نے اپنا دینار ڈھالا تو وہ ایسے دینار ڈھالے گا جس پر نبی اسلامؐ کے خلاف عبارتیں لکھی ہوں گی۔ اس کے باوجود عبد الملک نے اپنا دینار ڈھالا اور اپنے سرحدوں کے اندر بیزنطی دینار کے تداول پر پابندی نافذ کر دی۔ اس عمل کی وجہ سے بیزنطی حکومت نے معاہدۂ جنگ بندی توڑ دیا اور دونوں ملکوں کے درمیان پھر جنگ شروع ہوگئی۔ اس جنگ میں اسلامی فوج کو کامیابی ملی اور اس نے نہ صرف بیزنطی سلطنت کے کچھ علاقوں پر قبضہ کر لیا بلکہ سنہ ۹۹ھ (۷۱۷-۷۱۸ء) میں قسطنطنیہ کا بھی محاصرہ کر لیا [۲]۔ اس کے بعد سے اسلامی دینار نہ صرف ملک کے اندر بلکہ باہر

---

[۱] دانق یونانی زبان سے معرب لفظ ہے اور شروع کے اسلامی دور میں استعمال ہوتا تھا۔ یہ احناف کے نزدیک ۰ء۵۲۱ گرام اور دوسرے فقہاء کے نزدیک ۰ء۴۹۶ گرام کا ہوتا تھا (مترجم)۔

[۲] یہ قسطنطنیہ کا دوسرا عرب محاصرہ تھا۔ پہلا محاصرہ امیر معاویہ کے زمانے میں ۶۷۴-۶۷۸ء میں ہوا تھا اور وہ بھی ناکام رہا تھا (مترجم)۔

کے علاقوں میں بھی استعمال ہونے لگا اور اسے لاتینی زبان میں "منکوس" Mancus[۳] کہا جاتا تھا۔

بالاختصار، عربی دینار کے ڈھالنے سے مقامی اور عالمی اقتصادیات پر جو اثرات پڑے وہ ڈاکٹر عادل زیتون کی تحقیق کے مطابق (مجلہ العربی، شمارہ ۵۰۸) یہ ہیں:

بیزنطی شہنشاہیت سے اقتصادی آزادی: اسلامی دینار کے ڈھالنے سے پہلے مسلم حکومت اپنی تجارت میں بیزنطی دینار اور ساسانی درہم پر انحصار کرتی تھی لیکن سنہ ۷۷ھ میں اسلامی سکہ ڈھالنے سے یہ تابعیت ختم ہوگئی اور اسلامی حکومت اقتصادی طور سے آزاد ہوگئی۔

عالم اسلامی کے نقدی نظام کا قیام: اسلامی دینار کے ڈھالے جانے سے پورا عالم اسلام خود اپنے سونے اور چاندی کے سکے استعمال کرنے لگا جس کی وجہ سے عالم اسلام میں اندرونی اور خارجی تجارت آسان ہوگئی۔

بین الاقوامی تجارت پر اثر اندازی: اسلامی سکے اپنی عمدگی اور دقیق وزن سے پہچانے گئے جس کی وجہ سے ان کا بین الاقوامی دبدبہ قائم ہوا اور بین الاقوامی بازاروں میں ان پر اعتبار کیا جانے لگا۔ یہ سکے یورپ، ہندوستان اور چین تک سے تجارت کے لئے استعمال کئے جاتے تھے، جس کی وجہ سے اسلامی دینار نے مشرق وسطی اور شمالی افریقہ میں بیزنطی دینار کی جگہ لے لی۔

اسلامی حکومت کی اقتصادی طاقت میں اضافہ: اسلامی دینار ڈھالنے کی وجہ سے اسلامی حکومت کی اقتصادیات کو طاقت ملی کیونکہ اب اسی سکے سے ٹیکس اور جزیہ کی ادائیگی ہونے لگی، اسلامی علاقوں کے بازاروں کی ساکھ مضبوط ہوئی اور وہاں غیر ملکی تاجر آنے لگے۔

مالی نظام میں اسلامی ثقافت کا اثر: اسلامی دینار پر عربی نقوش ہوتے تھے جس کی وجہ سے عربی زبان پھیلی اور مسلمانوں کی ثقافتی آزادی مضبوط ہوئی۔ ان سکوں پر "لا الہ الا اللہ، محمد رسول اللہ" لکھا ہوتا تھا جس سے اقتصاد میں اسلامی شخصیت کا دبدبہ قائم ہوا۔ آج بھی جب اقتصادی تاریخ کا ذکر ہوتا ہے تو اسلامی دینار کا ذکر ضرور ہوتا ہے کیونکہ وہ انسانی تہذیب میں ایک بڑا تاریخی اضافہ تھا۔

(الجزیرہ، ۳۱ر مارچ ۲۰۲۵–ترجمہ: ظفر الاسلام خان)

---

(۳) منکوس عربی لفظ "منقوش" کی تحریف ہے (مترجم)۔

اندلس کے مسلمانوں کا پوشیدہ لٹریچر

اندلس کی آخری مسلم مملکت غرناطہ کا سقوط ۱۴۹۳ء میں ہوا اور باقیماندہ عربوں کو ۱۶۰۹ء میں اندلس سے زبردستی نکال دیا گیا۔ اندلس میں اسلامی حکومت کے خاتمے کے بعد جو عرب مسلمان رہ گئے تھے، ان کو دھیرے دھیرے زبردستی عیسائی بنالیا گیا تھا۔ پھر بھی ان میں ایسے لوگ تھے جنہوں نے خاموشی سے مزاحمت جاری رکھی۔ وہ چھپ چھپ کر اسلامی فرائض ادا کرتے رہے اور اپنی آنے والی نسلوں کو عربی زبان اور اسلام کی تعلیم بھی دیتے رہے حالانکہ یہ کرتے ہوئے پکڑے جانے والوں کو موت یا دوسری سخت سزاؤں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

اسپین کی محقق پروفیسر لوتھی لوبیت بارلیت نے اس خفیہ میراث کو سامنے لانے کے لئے بہت کوشش کی ہے۔ ان کی کتاب کا عربی ترجمہ "الادب السری لمسلمی اسبانیا الاواخر" ریاض سے شائع ہوا ہے اور کچھ ماہ قبل اس کو قطر کے شیخ حمد کا عربی میں ممتاز ترجمہ کی گئی کتاب کا انعام دیا گیا ہے۔ اسپین کی اس محقق کے اجداد بھی اندلس کے وہی عرب تھے جن کو زبردستی عیسائی بنالیا گیا تھا۔ پروفیسر بارلیت پوئرٹوریکو یونیورسٹی میں مقارن ادب کی استاد ہیں اور تونس میں قائم عالمی سوسائٹی برائے موریسکی مطالعات کی ۱۹۸۳ء سے نائب صدر ہیں۔ اپنی کتاب کے مواد ان کو یوروپ، ترکی اور بعض عرب ممالک کی لائبریریوں میں ملے۔

سقوط غرناطہ اور باقیماندہ عربوں کے زبردستی نکالے جانے کے درمیان جو وقفہ گزرا ہے اس

میں ان لوگوں پر بے شمار ظلم ڈھائے گئے۔ ان کو زبردستی عیسائی بنایا گیا، ان کے کلچر اور عادتوں کو ممنوع قرار دیا گیا اور بالآخر سنہ ۱۵۶۶ء میں ان کو عربی زبان لکھنے اور بولنے سے بھی منع کر دیا گیا۔ اس کے بعد ان لوگوں نے آپس میں بات کرنے کے لئے ایک نئی زبان ایجاد کی جس کو "خمیادو" کہتے ہیں اور وہ کاسٹیلین (قشتالی) اور عربی زبانوں کی مرکب تھی اور اسے عربی حروف میں لکھا جاتا تھا۔ "خمیادو ادب" کے ذریعے ان لوگوں نے اپنے دین و ثقافت کو باقی رکھنے کی کوشش کی اور اپنے عقائد، حالات اور آلام کو کاغذ پر لکھ کر محفوظ رکھا۔ اس طرح کی تحریریں لکھنا اور رکھنا بھی جرم شمار کی جاتی تھیں۔ اس لئے یہ لوگ ایسی تحریروں کو چھپا کر رکھتے تھے، ان کو دیواروں میں یا فرش کے نیچے دبا دیتے تھے یا چھت پر کہیں چھپا دیتے تھے۔ موجودہ کتاب ۱۱۵۳ صفحات پر ۲ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں علم نجوم، آخری زمانے کے بارے میں پیشین گوئیاں، کھانے پینے کی چیزیں بنانے کے طریقے، تعویذیں، خوابوں کی تفسیر، علاج کے طریقے، اسپین سے باہر، خاص طور سے ترکی، جانے کے راستوں کی تشریح، شادی بیاہ کے طریقے جیسے امور پر تحریریں شامل ہیں۔ اس کے لکھنے والوں نے اپنے آبا و اجداد سے جو معلومات دین، زبان اور ثقافت کے بارے میں حاصل کی تھیں انھیں محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ ان تحریروں کا بہت خفیہ طریقے سے آپس میں تبادلہ کرتے تھے کیونکہ پکڑے جانے پر سخت ترین سزاؤں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ان تحریروں سے ان تاریخی اور سیاسی حالات کا پتہ بھی چلتا ہے جس کا ان عربوں کو سقوط غرناطہ کے بعد مقابلہ کرنا پڑا۔ سقوط غرناطہ کے بعد اندلس میں رہنے والے عربوں کو اسپینی حقارتاً "موریسکو" کہتے تھے یعنی "چھوٹا عرب"۔ اسی لئے یہ ذخیرہ "موریسکو ادب" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ (ظ۔ اَ۔ خ)[1]

توت عنخ آمون کے نوادرات کی مصر میں نمائش

مصری آثار قدیمہ کو بحال کرنے والوں میں شامل عید مرتاح نے بچپن میں کافی وقت تاریخ کی کتابوں کے مطالعہ میں گذارے۔ فرعونی عہد کے بادشاہ توت عنخ آمون کے بارے میں خوب پڑھا۔ اس کے بعد ہیروغلیفی زبان و رسم الخط کے رموز سے آگاہی حاصل کی۔ ایک دن نوجوان

---

[1] الجزیرۃ (۲۷ مئی ۲۰۲۵ء) میں محمد خیر موسی کی تحریر "الأدب السري لمسلمي إسبانيا الأواخر.. الألخميادو وتلمس سبل النجاة بالكتابة" کا خلاصہ۔

بادشاہ کو زریں نقاب تھامے ہوئے خواب میں دیکھا۔ چند برسوں بعد مرتاح نے خود کو توت عنخ آمون کے مذہّب چیمبر سے خاک جھاڑتے ہوئے پایا، جب اسے قاہرہ کے عظیم عجائب گھر میں منتقل کرنے کی تیاری کی جارہی تھی۔ مرتاح نے ''فرانس پرس'' نیوز ایجنسی کو بتایا کہ توت عنخ آمون کے نوادرات نے مجھے مزید مطالعہ پر مجبور کیا۔ اس مجموعے پر کام کرنا میری زندگی کا خواب تھا اور اب یہ خواب پورا ہوگیا ہے۔ ۱۵۰ سے زیادہ بحال کار اور ۱۰۰ آثار قدیمہ کے ماہرین دس سال سے زائد عرصے سے مصری عجائب گھر میں نمائش کے لیے ہزاروں نوادرات کی بحالی پر کام کر رہے ہیں۔ اس عجائب گھر کی تعمیر ۲۰۰۰ء میں شروع ہوئی تھی۔ اس پر ایک بلین ڈالر کا صرفہ آیا ہے۔ اس کے افتتاح کی تاریخ ۳/ جولائی مقرر تھی، لیکن ایران اور اسرائیل جنگ کی وجہ سے اس کی تاریخ رواں سال کے آخر تک ملتوی کر دی گئی ہے۔ اہرامات جیزہ کے نیچے بنائے گئے اس عظیم الشان میوزیم کو دیکھنے کے لیے سالانہ ۵۰ لاکھ زائرین کی آمد متوقع ہے (صحیفۃ الوطن، بحرین، ۹ جولائی ۲۰۲۵ء)۔

مصنوعی ذہانت سے بات چیت کے خطرناک اثرات کا انکشاف

مصنوعی ذہانت (AI) سے بات چیت کے خطرناک اثرات کے سلسلے میں ایک تحقیق سامنے آئی ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ ایک تفتیشی صحافی کو صارفین کی طرف سے الرٹس یعنی ہوشیار کرنے والے ای میل موصول ہوئے۔ ان سے پتہ چلا کہ مصنوعی ذہانت کے بوٹ ChatGPT نے اس سے عجیب دریافتوں اور سنسنی خیز دعوؤں کے بارے میں رابطہ کرنے کی سفارش کی ہے۔ ان پیغامات میں فرضی گفتگو شامل تھی۔ جیسے جیسے تحقیقات گہری ہوتی گئی، یہ واضح ہوگیا کہ ہزاروں آن لائن صارفین طویل خیالی گفتگو کا شکار ہو چکے ہیں۔ ماہرین نفسیات کے مطابق کچھ تحریریں پریشان کن تھیں۔ چیٹ ٹولز ان لوگوں میں فریب کو تقویت دے سکتے ہیں جو دھوکہ دہی کا سب سے زیادہ شکار ہوتے ہیں۔ یہ نتیجہ مصنوعی ذہانت کے ٹولز کو ریگولیٹ کرنے اور صارفین کو ممکنہ نفسیاتی اثرات سے بچانے کے لیے تحفظات فراہم کرنے کے لیے بڑھتی ہوئی کالوں کے درمیان سامنے آیا ہے۔ (صحیفۃ الوطن، بحرین، ۲ جولائی ۲۰۲۵ء)

(ک۔ص۔اصلاحی)

وفیات

مولانا عزیز الحسن صدیقی مرحوم

(۱۹۳۲ء-۲۰۲۵ء)

محمد عمیر الصدیق ندوی

افسوس کہ مولانا عزیز الحسن صدیقی اس عالم فانی سے رخصت ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ قریب بانوے سال کی عمر مستعار ملی۔ جس کا حق دین و ملت اور قوم و جماعت کی مسلسل اور مفید خدمات کے ذریعہ ادا بھی خوب کیا۔ علم و عمل اور کاغذ و قلم نے شہرت اور اس سے زیادہ عوام و خواص دونوں میں مقبولیت حاصل کی۔ غازی پور کے اپنے آبائی علاقے میں خود کو محدود رکھنے یا مستور رہنے کی دانستہ کوشش کے باوجود ان کی علمی و دینی برکتوں کا اقرار ہر طبقۂ علم میں ہوتا رہا۔

مشرقی یوپی میں غازی پور کی بستی کی تاریخی اہمیت بیان کی جاتی رہی ہے۔ سالار مسعود غازی جیسے ناموں سے اس کی تاریخ کے تعلق نے اس سرزمین کی قدامت میں مسلمانوں کے وجود کو نمایاں طور پر شامل کر دیا۔ جس طرح دہلی والوں کے لیے برہان پور کبھی باب دکن تھا، غازی پور بھی اسی طرح باب مشرق ثابت ہوتا رہا۔ سیاسی اہمیت وقت کے ساتھ کم ہوتی گئی لیکن انگریزوں کے زمانے میں سر سید اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری جیسی شخصیتوں نے غازیپور کی عظمت رفتہ کو گویا زندہ کر دیا۔ اس زندگی نو میں غازی پور کے مدرسہ چشمۂ رحمت کا بھی بڑا حصہ رہا۔ یہی وہ مدرسہ ہے جہاں علامہ شبلی نے مولانا محمد فاروق چریاکوٹی سے تلمذ کی دولت حاصل کی۔ دہلی کے مشہور حکیم نابینا اسی مدرسہ میں علامہ شبلی کے ہم جماعت رہے۔ اصلاً اس مدرسہ کی بنیاد مولانا رحمت اللہ فرنگی محلی نے رکھی تھی، اس کی برکتوں نے غازیپور اور اس کے اطراف میں ایسی ہستیوں کی تشکیل کی جن کے لیے کہا گیا کہ ان کے بوریائے فقر کی بلندی، مسند شاہی سے کم نہ تھی۔ لیکن وقت کی گردش کے اپنے پیمانے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے ستاروں کی روشنی مدھم ہونے لگی، ایسے میں اگلی سی شہرت پر گم نامی کا سایہ گہرا ہو گیا۔ حالات کی حقیقت سامنے ہو تو پھر مولانا عزیز الحسن صدیقی کے بارے میں جاننا ضروری ہو جاتا ہے

کہ کس طرح ان کی نواؤں میں آتش رفتہ کی حدت و حرارت شامل ہوئی۔

غازیپور میں گنگا کی لہریں بنارس کے ساحلوں سے بھی زیادہ پھیل کر آبجو سے ایک بیکراں نظارے میں بدل جاتی ہیں۔ یہی بیکرانی یا بے قراری غازیپور کے خطہ کے نصیب میں آئی۔ تاریخ اس کو گوتم بدھ کی رہ گذر بتاتی ہے لیکن سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقائے جہاد کے خیموں کے نشان آج بھی زندہ ہیں اور بتاتے ہیں کہ کیسے کیسے کارواں اس راہ سے گزرتے رہے۔ بابر، شیر شاہ، اکبر اور پھر سرسید اور علامہ شبلی، یہ علاقہ تاریخ کی عظمتوں کا گواہ ہی نہیں خود اپنے نام سے داستان بن گیا۔ داستانیں عروج و زوال کے مضامین کی امین ہوتی ہیں، غازیپور نے اس کی بھی کہانی بیان کر دی۔ مولانا صدیقی مرحوم اس راہ گزر پر قافلوں کی آمد و رفت کو نئی زندگی دے دی۔

سنہ ۱۹۲۸ء میں اللہ کے ایک نیک بندے مولانا عمر فاروق نے مدرسہ چشمہ رحمت کی تاریخ کا احیاء، مدرسہ دینیہ کے نام سے کیا۔ اس کام میں ان کی مدد کے لیے قدرت نے مولانا ابوالحسن کی شکل میں ایک مخلص رفیق دے دیا۔ یہی مولانا عزیز الحسن صدیقی کے والد مولانا ابوالحسن تھے۔ جن کی زندگی جہد مسلسل سے عبارت تھی۔ وراثت میں یہی دولت ان کے بیٹے کی قسمت میں آئی، ان کی آپ بیتی بھی عجب ہے، زندگی نے علم، شرافت اور خودداری کے اسباق پڑھا کر تنگ دستی، مفلوک الحالی، غیرت و خودداری اور محنت مزدوری کے خوب امتحان لیے۔ نتیجے میں کامیابی ملنا ہی تھی جس کی تصویر اب غازی پور کا مدرسہ دینیہ ہی نہیں، انجمن صیانت المسلمین، رسالہ تذکیر، تحریک پیام انسانیت، رابطہ ادب اسلامی اور مقامی طور پر رفاہ عام کے لیے سرگرم عمل تنظیموں کا ایک سلسلہ ہے۔ جس نے غازی پور کے نام کو نئی معنویت بخش دی۔

مولانا مرحوم کی یادوں کو زندہ رکھنے کے لیے مدرسہ دینیہ ہی کافی ہے۔ لیکن مولانا کا رسالہ تذکیر شاید مولانا کی خدمات کو تب و تاب بخشنے کے لیے زیادہ یاد کیا جائے۔ یہ چھوٹا سا رسالہ، بہت سے بہت چالیس پچاس صفحات کا پیرہن لیے ہوئے، لیکن مولانا کے عام فہم اور نہایت دلکش، اور پر اثر اسلوب میں قومی و ملی مسائل کا جس طرح اعمال نامہ بنا اور اہل ذوق کی توجہات کا مرکز بنا، شاید ہی ان کے دور کے کسی بڑے سے بڑے ادیب کی تحریروں نے اس کے قارئین کو اس طرح بے تاب کیا ہو۔ ہر پڑھنے والے کے دل سے آواز نکلتی کہ واقعی رسالہ تذکیر، نام ہی نہیں کام کے لحاظ سے بھی سراپا تذکیر ہے۔ عقل و شعور کے ساتھ انسانی جذبات و احساسات کو ابھارنے کا سلیقہ،

جس ہوش مندی اور فکر مندی سے اس رسالہ نے کیا اس نے واقعی تذکیر کو اپنی نوعیت کا ایک الگ ہی رسالہ بنا دیا۔

جاپان میں اس رسالہ کے ایک قدرداں نے صحیح کہا تھا کہ حالات حاضرہ کے حوالے سے اصلاح امت و معاشرہ اور اتحاد اسلامی پر اس کے دردمندانہ مشوروں اور نصیحتوں کی وجہ سے جاپان میں بھی ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ اس کے مندرجات پرانے ہونے کے باوجود تازہ معلوم ہوتے ہیں۔ پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی کی پسند، ناپسند کے معیار سے جو واقف ہیں ان کے لیے یہ الفاظ واقعی خوشگوار حیرت والے تھے کہ شمارہ لاجواب ہے، دل خوش ہو گیا، پورا رسالہ ایک ہی نشست میں پڑھ گیا۔

پروفیسر محسن عثمانی جیسے ادیب و دانشور نے مولانا مرحوم کی تحریروں سے دلچسپی اور شوق کا اظہار کرتے ہوئے بڑی عمدہ بات کہی تھی کہ اس چھوٹے سے منحنی رسالے کی ہر تحریر تمام مسلمان پڑھیں اور اسے سرمۂ چشم بنائیں۔

مولانا عزیز الحسن صدیقی کی یہ ادارتی تحریریں پہلے ابتدائیہ، پھر نظرات کے عنوان سے مولانا دریابادی کی سچی باتوں کی یاد دلا دیتیں جو اختصار، ایجاز اور ادب و انشا کے فرق کے باوجود دل میں اتر جانے والے ہنر اور اثر میں کہیں سے کم نہیں۔ ان تحریروں کے علاوہ مولانا کے مضامین، شخصی تاثرات اور سب سے بڑھ کر ان کی آپ بیتی ہمہ خاکم کہ ہستم، سب ان کی شخصیت کے غیر معمولی ہونے کا ثبوت بن گئے۔ ان کا ایک تحقیقی مضمون ملک السادات سید مسعود غازی پر بڑا قیمتی تھا جس سے اس شبہ کا ازالہ ہوا کہ یہ سالار مسعود غازی ہی تھے۔ مولانا نے بدلائل ثابت کیا کہ دونوں کی شخصیتیں بالکل جدا ہیں لیکن خود مولانا مرحوم کی شخصیت علمائے قدیم سے جدا نہیں تھی، صاف شفاف لباس اور اس سے زیادہ مزاج و طبیعت کی نفاست، چہرے پر ہمیشہ شفقت کی نرم دھوپ اور باتوں میں وہی گلوں کی خوشبو، علمائے سلف کی ہر امانت کی حفاظت کا شعور لیے ہوئے ایسے چہرے اب کہاں؟ ہاں مدرسہ دینیہ، صیانت المسلمین اور ان کے صاحبزادوں، خاص طور پر ہر کام میں ان کے رفیق صاحبزادہ مولوی سعود الحسن ندوی اور شاگردوں اور سب سے بڑھ کر ان کی تحریروں سے ان کے نہ ہونے کا احساس شاید کچھ کم ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ حسنات کو قبول فرمائے اور درجات بلند سے نوازے۔ آمین

باب التقریظ والانتقاد

دولت عثمانیہ اور ترکی کی تاریخ۔ مولانا عتیق احمد بستوی

محمد عمیر الصدیق ندوی

ترکی اور ترکوں سے ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق اس زمانے سے جذباتی اور گہرا رہا ہے جب اطلاعات و ابلاغ کے ذرائع کی کثرت تھی اور نہ آسانیاں فراہم تھیں۔ معلومات خواہ تاریخی ہوں، جغرافیائی ہوں یا سیاسی ہوں، بہت محدود تھیں اور اس لیے ان میں عوامی دلچسپی کا سامان بھی کم تھا، پھر بھی ترکی سے دوری اور وہاں کے احکام سلطانی کی عدم پیروی، ایک رشتہ اخوت کے قوی اور مستحکم ہونے اور رہنے میں مانع بھی نہیں تھی۔ اس کی وجہ غالباً یہی تھی کہ ترکی، خلافت اسلامیہ کی روایتی ذمہ داری کو نبھانے والے ملک کی پہچان لیے ہوئے تھا اور اس حقیقت کے ساتھ کہ خلافت کی حیثیت اور افادیت گرچہ سابقہ خلافتوں کی طرح وسیع تر اور موثر تر نہیں تھی لیکن مذہب کی بنیاد پر شیرازہ بندی کی کمزور ہی سہی لیکن کسی نہ کسی درجہ میں روح برقرار تھی۔ اور یہی روح کی برقراری تھی جو ترکی کے حریفوں اور رقیبوں کے لیے بے قراری کا سبب بن گئی۔ قومیت کے نام سے اپنے اور جدید کے نام پر یورپ نے ترکی کو بیمار بنادینے کا جو عمل شروع کیا وہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی عالمی سیاست کا بڑا عنوان بنتا گیا۔

انیسویں صدی کا نصف آخر ہندوستانی مسلمانوں کے لیے قیامت خیز تبدیلیوں بلکہ بربادیوں کا زمانہ بن گیا۔ انگریزوں کی حکومت کے قیام نے جو بھی برے بھلے تغیرات سے ملک پر اثر ڈالا اس میں عالمی حالات سے زیادہ واقفیت حاصل کرنے کا فائدہ بھی تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ۱۸۹۷ء کی یونانیوں سے جنگ اور پھر ۱۹۱۱ء میں اٹلی سے ترکوں کی جنگ کے حالات لکھے گئے اور اس وقت کئی کتابیں بھی اس موضوع پر شایع ہوئیں، جس سے ہندوستانی مسلمانوں میں بڑا جوش دکھائی دیا۔ اس کی وجہ شاید کسی اعتراض کے جواب میں بتائی گئی کہ ہندوستانیوں کو ترکی سے روحانی تعلق ہے۔ اس لیے ان کو ان ترکوں کی مصیبت کا احساس کیوں نہ ہو؟

انیسویں صدی کے نصف آخر کی یہی وہ نئی فضا تھی جس کے زیر اثر دنیائے اسلام میں سید جمال الدین افغانی کی تحریک اتحاد اسلامی کا ظہور ہوا۔ سید جمال الدین افغانی کا ترکی اور ترکی سلطنت سے تعلق اتنا طاقت ور تھا کہ ترکی سلطان عبد الحمید خاں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور جو برائے نام خلیفہ تھے ان کو دنیائے اسلام کے فرماں روا کی حیثیت سے ہر جگہ خلیفۂ اسلام اور امیر المومنین تسلیم کیا جانے لگا، مولانا سید سلیمان ندوی کے بقول جس وقت یہ تحریک اتحاد اسلامی اٹھی تو انگریزوں نے تہیہ کر لیا کہ اس سلطنت کا خاتمہ کر دیا جائے وہ دل سے چاہتے تھے کہ ترک کسی طرح مضبوط نہ ہونے پائیں تاکہ کروروں مسلمان جو خلیفہ کی سلطنت میں رہتے ہیں وہ خلیفہ کے ایک اشارہ پر بغاوت کے لیے آمادہ نہ ہو جائیں۔۱۸۷۷ء میں جب روس اور ترکوں کی جنگ ہوئی تو اسلامی دنیا میں جیسے آگ لگ گئی۔

یہ تفصیل کتابوں میں موجود ہے، یہاں صرف ہندوستانی مسلمانوں کی ترکوں سے محبت کا ذکر مقصود ہے کہ کس طرح اس محبت نے تمام ہندوستانیوں کے دلوں میں ترکی کے لیے امداد واعانت کے جذبات بھر دیے۔ علامہ شبلی اس وقت بیس سال کے تھے لیکن انھوں نے اعظم گڑھ میں مستعدی سے خاصی خطیر رقم جمع کر کے قسطنطنیہ بھیجی۔ ترکوں سے اسی محبت نے علامہ شبلی کی ترکی کے سفر کی راہ ہموار کی اور پھر ترکوں کے متعلق علامہ کی شاعری نے ہندوستانیوں کے دلوں میں ترکوں کے لیے جس دینی اور سیاسی تعلق کو زندہ کیا، ہندوستان اور ترکوں کے تعلقات کی تاریخ اس سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ ترکوں کی محبت میں تحریک خلافت، اسی محبت کا نقطۂ عروج ہے۔ تحریک خلافت، الغائے خلافت کے بعد بے معنی ہو کر رہ گئی لیکن ترکوں سے محبت کبھی اپنی معنویت سے دستبردار نہیں ہوئی۔

اسی لیے دارالمصنفین کے قیام کے دور اول میں دولت عثمانیہ کی تاریخ کی تالیف و ترتیب کو ترجیحی درجہ حاصل ہوا اور اردو زبان میں پہلی بار خلافت عثمانیہ کی ایک مستند اور مفصل تاریخ سامنے آگئی۔

اس دوران ترکی کی تاریخ اور مابعد خلافت، حکومت و سلطنت کے مختلف مراحل پر کتابیں اور تحریریں آتی رہیں اور یہ سلسلہ کم و بیش اب تک جاری ہے۔ اسی سلسلے کا تازہ ترین اضافہ مولانا عتیق احمد بستوی کی تین جلدوں پر مشتمل علمی و تحقیقی عمل ہے جس کو دولت عثمانیہ اور ترکی کی تاریخ کا نام

دیا گیا اور تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ کی ذیلی سرخی سے اس محنت کی نوعیت کو سرورق پر ظاہر کر دیا گیا۔

مولانا عتیق احمد بستوی کے تعارف میں ان کی سب سے پہلی اور بڑی صفت فقہ اسلامی میں ان کی مہارت کی ہے۔ فن تاریخ ان کا اصل موضوع نہیں ہے لیکن تاریخ کے مطالعہ میں جس فنی فہم وبصیرت اور واقعات کی تہہ میں کارفرما عناصر کو دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ شاید ایک صاحب فقہ کو زیادہ آسانی سے میسر ہوتی ہے۔ اس بات کا اندازہ مذکورہ کتاب میں کی گئی محنت اور تجزیہ کے طریق کار سے ہوتا بھی ہے۔

کتاب کے پہلے حصہ کے سرورق کی عبارت میں دولت عثمانیہ کے عروج وزوال، عبدالحمید خاں کا دور، مصطفیٰ کمال، اور ترکی میں اسلامی اقدار کا احیاء اور رجب علی اردوگان کا موجودہ عہد تک اس مطالعہ کی ابتدا وانتہا کی خبر ہے۔ پہلی نظر میں لگتا ہے کہ یہ مضامین حصہ اول کے ہیں لیکن دوسرے اور تیسرے حصہ میں بھی سرورق پر یہی عبارت ہے۔ یعنی مذکورہ عبارت تینوں حصوں کے مضامین کی خبر ہے۔

پہلے حصہ کی ابتدا بعض ذیلی اور ضمنی تحریروں سے ہوتی ہے جیسے قاضی عدیل عباسی کی کتاب 'تحریک خلافت' پر تبصرہ اور سلطان عبدالحمید ثانی اور مسئلہ فلسطین اور سلاطین عثمانی اور خلافت۔ ان مضامین کے بعد اصل تاریخ کا بیان ہے جس کو عروج وزوال کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ اس میں پہلے دولت عثمانیہ کے قیام اور پھر سلطان اور خاں سے سلطان مراد خاں خامس تک کے خلفا یا سلاطین عثمانیہ کا ذکر ہے جن کے مصادر زیادہ تر عربی کتابیں ہیں۔ اس ذکر میں اختصار کے ساتھ فرماں رواؤں کے عزل و نصب اور فتوحات و ہزیمتوں کو بیان کر دیا گیا ہے۔ عروج و زوال کے معاشی، علاقائی اور سب سے بڑھ کر معاشرتی اسباب سے بحث نہیں کی گئی۔ آخری صفحات میں اس کمی کی تلافی دور اصلاحات کے جائزے سے کی گئی اور چند جملوں میں فوجی تنظیم اور نظام سلطنت کی نشان دہی کر کے نپولین کے حملے کو اسی تناظر میں دیکھا گیا کہ سلطان سلیم ثالث کے دور یعنی ۱۷۸۹ء سے انتظامی، فوجی اور معاشرتی اصلاحات پر توجہ ہوئی۔ ان میں تعلیم، تجارت اور فوج میں ینی چری کی قدیم فوجی تدبیروں کے اصلاح ہی نہیں استیصال کی ضرورت بھی ہے۔ اس کے جو اثرات کامیابی یا ناکامی کی شکل میں ظاہر ہوئے ان کو زیادہ تر عرب کے ترکی شناس اہل قلم و فکر کی روشنی میں پیش کر کے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا کہ ترکی کے علمانے اصلاحات کے نفاذ میں قائدانہ کردار ادا نہیں کیا۔

یہ قائدانہ کردار کیا ہونا چاہیے تھا؟ یہ سوال بہر حال اپنی جگہ تشنہ ہی رہا۔ پہلے حصہ کا آخری باب، ایران کے صفوی حکمرانوں کا ذکر صفویوں کی سازشوں کے عنوان سے ہے۔ اس میں ایک جملہ یہ بھی ہے کہ صفویوں نے ایرانی قومیت بیدار کرکے ایران کو عالم اسلام سے الگ تھلگ کر دیا تھا۔ اس لیے ایران اسلام دشمن طاقتوں کی امیدوں کا مرکز بن گیا۔ یہ مصنف کے وہ جملے ہیں جو کسی اور حوالے کے بغیر مطالعہ کا نچوڑ سمجھے جاسکتے ہیں۔ ضمیمہ کے طور پر امیر البحر خیر الدین باربروسہ کے مختصر حالات بھی ہیں جو کرنل عبدالرشید کے قلم سے ہیں اور جن کو ترکی کی تاریخ میں باربروسہ کی اہمیت کی وجہ سے کتاب میں شامل کرلیا گیا۔ اس طرح قریب پانسو صفحات پر مشتمل پہلا حصہ سلاطین آل عثمان کی مکمل فہرست سے پورا ہوا۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ آل عثمان کی اس تاریخ سے پہلے قریب دوسو صفحات میں مولانا جعفر مسعود ندوی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا بلال عبدالحی حسنی کی تقدیمی تحریروں اور علامہ شبلی، مولانا آزاد، امیر شکیب ارسلان اور مولانا علی میاں ندوی کی بعض شاہکار تحریروں کی شمولیت، اصل کتاب کے پڑھنے کے اشتیاق کو دوبالا کر دیتی ہے۔ کتاب کی تالیف و ترتیب کی اس داستان کی لطف و لذت میں اضافہ کرتی ہے جو فاضل مصنف نے قریب پچیس صفحات میں اس لیے بیان کی ہے کہ اس سے کتاب کا مقصد اور اس کی تصنیف کے محرکات کو آسانی سے سمجھا جاسکے۔ یہ ایک طرح سے صاحب تصنیف کی آپ بیتی ہے جس میں ان کی تعلیم و ذہن سازی کے ابتدائی اداروں سے دیوبند اور ندوہ کے سرچشموں تک کے سفر کے حاصل کی نشان دہی ہے۔ ۱۹۸۰ء میں جب وہ ندوہ آئے تو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تھے جنھوں نے ترکی اور خاص طور پر سلطان عبدالحمید ثانی کی تاریخ کے مطالعہ اور پھر اس کی ترتیب کا مشورہ دیا۔ یعنی ۲۰۲۳ء میں جو مرحلہ طے ہوا اس کی مدت قریب نصف صدی کی ہے۔ اسی سے اس کتاب کی فکر اور اس کے لیے مطلوب مراجع تک رسائی اور پھر تحقیق و تجزیہ کے دشوار گزار مراحل کا اندازہ لگانا مشکل نہیں رہ جاتا۔ اس کے ثبوت کے لیے اور مصنف کی جاں سوز محنت کے لیے یہی حصہ اول ہی کافی ہے۔ لیکن خوب سے خوب تر پیش کش کے لیے حصہ دوم میں جدا طور پر سلطان عبدالحمید ثانی کے دور خلافت پر توجہ مرکوز کی گئی اور حق یہ ہے کہ اس دور کے ہر پہلو کو جامعیت کے اعلیٰ معیار پر پیش کیا گیا۔ کوئی پہلو نظر انداز نہیں ہو سکا۔ یہ کہنا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ اس انتہائی انقلاب انگیز دور کا اردو میں یہ شاید پہلا مکمل جائزہ ہو۔ دور حمیدی

کے محاسن و قبائح، حوصلوں اور مجبوریوں، اور اتحاد و نفاق کی ہر علامت پر فاضل مصنف نے نظر کی، کبھی یہ مانگے کے اجالوں سے اور کبھی خود اپنی فقیہانہ بصیرت کی مدد سے ترکی کی تاریخ کے ایک باب کی تصویرکشی بہر حال کامیاب رہی۔

ایک موضوع تحریک اتحاد اسلامی کے تعلق سے بھی ہے جس کے ضمن میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، شیخ الہند مولانا محمود حسن، علامہ شبلی نعمانی، شیخ عبدہ اور مختلف تحریکوں جیسے تحریک سنوسی و وہابیت، اور تحریک تورانی کا ذکر بھی بڑا چشم کشا ہے۔ ساتھ ہی اسلام دشمن تحریکوں جیسے فری مین اور اس کے نتائج بد جیسے ماسونیت، صہیونیت، ترک قومیت، عرب قومیت پر بہت قیمتی مطالعات سے واقفیت ہوتی ہے۔ وہیں سابا تائیہ یا دونمہ نامی ایک اور یہودی فرقہ یا فتنہ کا بھی علم ہوتا ہے جس سے اردو داں طبقہ عموماً ناآشنا ہے۔ اس فرقے کے متعلق اس قسم کی معلومات واقعی حیران کن ہیں کہ اب بھی ترکی میں اس فرقے کے قریب تیس ہزار افراد ہیں اور ترکی کے تمام شعبہ ہائے زندگی میں ان کا اچھا اثر بھی ہے۔ یہ اطلاع الاتراک الیہود عبرالتاریخ کتاب کے حوالے سے ہے، ترکی کے مشہور ترین صحافی اور ذرائع ابلاغ کے ماہر اسی انتہا پسند یہودی فرقے کی پیداوار ہیں، یہاں تک کہ ایک زمانے میں ہندوستان میں ترکی کا پسندیدہ چہرہ خالدہ ادیب خانم کا تعلق بھی اسی فرقے سے بتایا گیا ہے۔ خالدہ کے تعلق سے اور بھی باتیں جو منور عیا شلی کی ایک کتاب مطبوعہ استنبول کے حوالے سے ہیں۔ خلافت ترکی کی شکست و ریخت کے اصل اسباب و عوامل سمجھنے کے لیے یہ حصہ کہا جاسکتا ہے کہ پہلے حصے سے فائق و مفید تر ہے۔

تیسرے اور آخری حصے میں موضوع، خاتمہ خلافت اور دور مصطفیٰ کمال اور پھر اسلامی بیداری کا ہے۔ فاضل مصنف نے ایمانداری سے صاف کر دیا کہ اس حصے کا بڑا حصہ فرید بک کی کتاب تاریخ الدولۃ العلیۃ العلمانیہ اور اس پر ڈاکٹر احسان حقی کے ضمیموں کے ترجمے پر مشتمل ہے۔ ساتھ ہی کتاب میں احمد راتب عرموش کی تحریر بھی ہے جو بقول مصنف دل و دماغ کو جھنجھوڑنے والی ہے۔

اس آخری حصے میں اسلامی بیداری کے موضوع میں شیخ سعید پیران، شیخ بدیع الزماں، سعید نورسی، نجم الدین اربکان اور اردوگان کی کوششوں کا بھی ذکر آگیا ہے۔

ایک اور اہم اور سب سے مبسوط باب قریب ساڑھے تین سو صفحات میں سلطان عبدالحمید ثانی کی سیاسی ڈائری کا ترجمہ ہے۔ یہ ڈائری مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی اس خواہش کی تکمیل ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یہ دونوں یادداشتیں ترکی کی اصل تصویر سامنے رکھنے کے لیے اس لیے اہم ہیں

کہ ایک ڈائری، خلیفہ ہونے کے زمانہ کی ہے اور دوسری معزولی و نظر بندی کے دور کی ہے۔ فاضل مصنف نے ان کو پیش کرنے کا جواز یہ بیان کیا کہ یہ صرف دولت عثمانیہ ہی نہیں بیسویں صدی کی عالمی تاریخ کے نشیب و فراز کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ موجودہ عالمی حالات میں یہود اور مسیحیوں اور ان کے ہم نوا نسل پرست اور استکباری فکر بلکہ سازشوں کو زیادہ تباہ کن بنانے والے حالات اور صرف اسلام اور مسلمانوں کے وجود کو نشانہ بنانے کے نفرت انگیز منصوبوں کی یلغار کی سنگینی کو سمجھنے کے لیے اس قسم کی کتابوں کا مطالعہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ تاریخ کو معروضیت سے پیش کرنے کے استشراقی طور طریقوں اور حوالوں اور کتابیات کے حوالوں کی مضحکہ خیز کثرت کو تحقیق کی میزان بتانے والوں نے بڑے منصوبہ بند طریقے سے واقعات و حالات کی حقیقت سے تیسری یا محکوم دنیا کو بڑے فریب میں مبتلا رکھا۔ مشرقی طرز تحقیق کو غیر معیاری بتانے کی سازش دوسری تمام سازشوں کی طرح مرعوب و مبہوت نظروں سے پوشیدہ ہی رہی۔ پچاس سال کی محنت سے تیار ہونے والی اس کتاب کے بین السطور سے اس کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔

فاضل مصنف دل سے تحسین و آفرین کے تمام جذبات کے حق دار ہیں۔ یہاں مولانا سید سلیمان ندوی کا یہ جملہ بھی دوبارہ پڑھنے اور غور کرنے کے لائق ہے جو انھوں نے ڈاکٹر محمد عزیر کی دارالمصنفین سے شایع ہونے والی تاریخ دولت عثمانیہ کے بارے میں لکھا تھا کہ یہ عظیم الشان سلطنت کی پہلی تاریخ ہے جو اردو میں لکھی گئی۔ اس سے پہلے اردو میں اس تعلق سے جو کچھ لکھا گیا وہ محض یورپین مصنفوں کے تراجم و خیالات تھے۔

یہی بات زیر نظر تین حصوں پر مشتمل اس کتاب کے لیے کہی جاسکتی ہے کہ ترکی اور ترکوں کو سب سے زیادہ قریب سے دیکھنے اور جاننے والے مورخوں و محققوں کے خیالات پہلی بار اس عمدہ ترتیب سے اردو میں پیش کیے گئے۔ آخر میں ایک اور کہی گئی بات کا اعادہ غالباً نامناسب نہ ہوگا کہ عرصے بعد ترکی کے ذکر و فکر کی نہایت موثر کاوش سامنے آئی۔ کاش یہ تاریخ کے تقاضوں سے پوری ملت کو آشنا کر دے۔

پیش نظر کتاب شاید اس آرزو کے پورا ہونے میں مددگار ہو۔ کتاب کی طباعت اور کاغذ عمدہ ہے، تینوں حصے مجلد اور یکساں رنگ میں ہیں، بالترتیب ۵۵۰، ۴۵۰، اور ۵۰۰ روپے قیمت ہے۔ سن طباعت ۲۰۲۴ء ہے اور ملنے کا پتہ ہے: مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوہ کیمپس، ندوۃ العلماء، ٹیگور مارگ، لکھنؤ، ۲۲۶۰۰۷

تبصرۂ کتب

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد، مرتب ڈاکٹر شمس بدایونی، تعلیمی سفر نامے، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۳۹۲، قیمت: ۵۰۰ روپے، سن اشاعت: ۲۰۲۲ء، پتہ: اپلائیڈ بکس ۱۰۴/ ۳۹/ ۱۷۳۹، فرسٹ فلور، ایم۔پی اسٹریٹ، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲، موبائل: ۹۹۵۳۶۳۰۷۸۸

خزانے مدفون ہوں یا مستور ہوں، ان کی قیمت کبھی کم نہیں ہوتی، ہاں یہ ضرور ہوتا ہے کہ ان خزانوں کو تلاش کرنے والوں اور بازیابی میں کامیاب ہونے والوں کی قیمت اور بڑھ جاتی ہے۔ زیر نظر کتاب کا معاملہ بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔

سر ضیاء الدین احمد کا وجود قوم وملک کے لیے کسی بیش قیمت خزانے ہی کی طرح نگاہوں کو خیرہ کرتا رہا۔ سرسید کا جو کارواں وقت کے ساتھ بنتا اور بڑھتا گیا، اس کے حدی خوانوں میں ڈاکٹر اور پھر سر ضیاء الدین کا نام سر فہرست نظر آتا تھا۔ اس حقیقت کی معراج یہ رہی کہ ان کو سرسید ثانی کا خطاب حاصل ہوا۔ ۱۸۷۳ء میں پیدا ہونے والے ضیاء الدین نے ۱۹۰۱ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگری، علم ریاضی میں حاصل کرکے اپنی منفرد امتیازی شناخت کا اعلان کر دیا اور اسی امتیاز نے ان کو یورپ کے ملکوں میں ریاضی کی بلند ترین سندوں کے حصول کی راہیں کھول دیں۔ ۱۹۰۴ء میں جب علم الحساب میں ان کو سر آئزک نیوٹن اسکالرشپ ملی تو یہ اعزاز حاصل کرنے والے وہ پہلے ہندوستانی تھے۔ حقیقت یہی ہے کہ ڈیڑھ سو سال کے جدید ہندوستان میں وہ اپنی قوم کے منتخب ترین افراد کی فہرست میں ہمیشہ یاد رکھے جانے کے مستحق ہیں۔ لیکن جب قوم یاد ماضی کو عذاب سمجھنے لگے تو یادوں کو بھولے بسرے افسانوں میں بدل جانے سے کون روک سکتا ہے؟

یہ سارے احساسات زیر نظر نہایت مفید، نہایت کارآمد اور نہایت معلومات افزا مطالعے سے کسی بھی قاری کے ہوسکتے ہیں۔

سفر نامے عموماً وہی ہوتے ہیں جن میں ایک سیاح، دیار غیر کے تاریخی، جغرافیائی، تہذیبی اور ثقافتی تجربات و مشاہدات ایک ترتیب سے اور اپنے ذوق ومزاج کی رعایت سے بیان کرتا ہے۔

فاضل مرتب نے اس مجموعہ مضامین کا نام تعلیمی سفر نامے رکھ کر شعوری طور پر اس کو عام اور روایتی سفر ناموں سے الگ پہچان دے دی۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ انگلینڈ، ہالینڈ، فرانس اور جرمنی کے سیر وسفر میں سیاح اپنے ایک ہی مقصد یعنی تعلیم کی دنیا کا مسافر رہا۔ مناظر اور جلوے وزندگی کی ہر ساعت کی طرح سفر کی حالت کا اظہار کرتے رہے مگر ہمارے سیاح کی نظر صرف اسی مرکزی نقطہ پر مرکوز رہی کہ وطن کی جس درسگاہ سے جسم وجاں کا رشتہ ابتدائی سانسوں سے استوار ہوا تھا اور جو نئے ہندوستان میں قوم میں نئی زندگی کی علامت بنادی گئی تھی، اس کو کس طرح دنیا کی نامور ترین درسگاہوں کی صف میں لایا جاسکے۔ وہ قریب پانچ سال یورپ کے علمی سرچشموں سے فیض یاب ہوتے رہے، مصر بھی گئے۔ اس پورے عرصے میں وہ اپنی مسافرانہ زندگی میں پابندی سے مضامین لکھ کر اپنے ہم وطنوں کو شریک کرتے رہے اور کم از کم اس احساس کی مسرت ظاہر کرتے رہے کہ ان مضامین سے لوگ یہ سمجھیں کہ علی گڑھ کالج، جامعہ ازہر سے زیادہ عمدہ درسگاہ ہے۔ تقابل کے لیے کسی اپنی ہی میراث کا انتخاب باعث حیرت نہیں کہ جب وہ یورپ میں تھے تو علامہ شبلی کی نظر قدر شناس کی برکت ان کو حاصل ہوئی۔ علامہ شبلی کا ایک خط فاضل مرتب نے نقل کر دیا اور اس سے پہلے یہ بھی واضح کر دیا کہ سر ضیاء الدین احمد کو علامہ شبلی سے خاص عقیدت تھی۔ وہ جہاں موقع ملتا، مولانا کا ذکر کرتے۔ مجلس مقننہ میں تقریریں کرتے تو علامہ شبلی کے حوالے سے گفتگو کرتے۔ انھوں نے الغزالی پر مفصل تبصرہ بھی کیا تھا جس کی یاد ان کو جرمنی میں بھی آئی تھی۔ علامہ شبلی نے خط میں ان کے ذوق وشوق کا اندازہ کرکے قانون مسعودی اور ابوریحان بیرونی، عمر خیام کی کتابوں کے کتب خانوں میں موجودگی کی خبر دی اور بتایا کہ شہرزوری کا ایک قلمی نسخہ جو طبعیات میں ہے ان کے پاس موجود ہے وہیں علامہ نے بتایا کہ علم ریاضی میں ابوالوفا جوزجانی، بتانی خازن بڑے پایہ کے لوگ اور مجتہد الفن ہیں، ان کی تحقیقات پر بھی توجہ کیجیے۔ علامہ شبلی سے یہی تعلق تھا جس نے ان کو اس طبقے میں استثنائی شان عطا کر دی جس طبقے کے بارے میں یہ خیال یقین میں بدل گیا تھا کہ جو لوگ مشرقی علوم کی تکمیل کے لیے یورپ کی درسگاہوں میں جاتے ہیں، اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ وہاں سے اس قدر مرعوب ہو کر واپس آتے ہیں کہ وہ ہمیشہ بے تحقیق وہاں کی تحقیقات اور نتائج تحقیقات کو علمی تحقیق کی آخری حد سمجھ لیتے ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے الفاظ

میں سر ضیاء الدین پرانے ماہر تعلیم تھے۔ نظام تعلیم کے موضوع پر ان کے ایک صدارتی خطبے کی خبر ملی تو سید صاحب نے لکھا کہ پہلے سے توقع تھی کہ وہ مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلہ پر اپنے ذاتی تجربوں اور مشاہدوں کی بنا پر بیان کریں گے، چنانچہ گو ان کا خطبۂ صدارت مختصر ہے مگر پر معنی ہے۔

پیش نظر کتاب نے ان کے تجربوں اور مشاہدوں کی معنویت کو ایک بار زندہ ہی نہیں کیا، موجودہ قومی کس مپرسی کے ایک بڑے درد کا علاج بھی پیش کر دیا۔

سفر ناموں کی ایک پہچان، جذبات کی سچائی بھی ہے۔ سر ضیاء الدین، سر سید سے محبت کے باوجود کہیں کہیں اختلاف بھی بڑے پیار سے کرتے نظر آتے ہیں مثلاً فرانس کی تعلیمی حالت کے بیان میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ معلوم نہیں سر سید مرحوم کو علی گڑھ کالج میں کھانے اور پینے کی تین قسم کی کلاسوں کا خیال کہاں سے پیدا ہوا جو کہ اصول اسلام اور یورپین اصول تعلیم کے خلاف ہے۔ یہی اسلامی اصول تعلیم ہیں جو اس کتاب کی ہر تحریر کو بیش قیمت بناتے جاتے ہیں۔ ان کے خیالات کی ایک مثال یہ جملے ہیں کہ:

> ہندوستان میں اگر اصل تعلیم پھیلانا مقصود ہے تو تعلیم کے مطمح نظر کو بالکل تبدیل کرنا پڑے گا۔ اس کی علت غائی صرف امتحانات پاس کر لینا نہ سمجھی جائے بلکہ تعلیم کی غرض و علت وہ شے ہو گی جس کے اعتبار سے ایک امی شخص بھی اکبر اعظم اور علاء الدین خلجی کی طرح تعلیم یافتہ ہو سکتا ہے اور ایم اے وغیرہ کے ڈگری یافتہ غیر تعلیم یافتہ ہو سکتے ہیں۔ تعلیم اور شے ہے، نوشت و خواند میں قابلیت پیدا کر لینا اور چیز ہے، جو تعلیم کا صرف ادنی جز ہے۔

تعلیم ان سفر ناموں میں زاد راہ رہی لیکن یہ سفر نامے اپنی خصوصیات سے بالکل عاری بھی نہیں، الگ الگ ملکوں اور معاشروں میں تہذیبی رجحانات اور ان کے رد و قبول کی تصویر جا بجا بڑی خوبصورتی سے سامنے آجاتی ہے، ذرا ذرا سے فاصلوں پر ان ملکوں کے طور طریق کا تغیر، سر ضیاء الدین نے جس باریک بینی سے دیکھا، اس میں ایک ریاضی داں سے زیادہ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب پر نظر رکھنے والے مورخ کی شان ہے۔

ضمیموں کے طور پر کچھ اور مضامین ہیں جن کو فاضل مرتب نے بنیادی موضوع کے تعلق سے پیش کر دیا کہ علم و حکمت کے یہ موتی بوسیدہ رسالوں کے اوراق میں گم ہو کر نہ رہ جائیں کچھ نادر تصویریں بھی ہیں۔ فاضل مرتب ڈاکٹر شمس بدایونی کی دنیائے تحقیق کی وسعتوں کا اندازہ ان کے

موضوعات سے کیا جاسکتا ہے۔ سر سید، غالب، شبلی جیسی شخصیات اور اصناف ادب میں مکتوب نگاری، شعریات اور سب سے بڑھ کر نعت شناسی پر ان کی محققانہ نظر اب مسلمہ حقیقت ہے اس کا تقاضا تھا کہ ایک اہم تاریخی شخصیت کے سوانح اور اس کے افکار و نظریات کو تحقیق کے بلند ترین معیار سے پیش کیا جائے۔ اس کتاب کا مقدمہ تحقیق و جستجو، ژرف نگاہی، دیدہ ریزی کے ساتھ پیشکش میں عالمانہ تواضع کی خوبصورت تصویر ہے۔ اردو ادب میں ایسی کتابوں کی موجودگی بجا طور پر اردو امت کے احساس برتری کو جائز بنا دیتی ہے۔ (محمد عمیر الصدیق ندوی)

ڈاکٹر فیضان احمد اعظمی، عہد وسطیٰ کا ہندوستان، تہذیبی و ثقافتی ورثہ: متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۳۳۲، قیمت: ۵۰۰روپے، سن اشاعت ۲۰۲۳ء، پتہ: البلاغ پبلی کیشنز، ابو الفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵، موبائل: ۹۹۷۱۴۷۷۶۶۴

اس مجموعۂ مقالات میں دو ابتدائیوں اور ایک ضمیمے کے علاوہ قریب ستائیس عنوانوں کے تحت تحریریں ہیں۔ ان سب میں تاریخی زاویہ سے مطالعہ کی محنت شامل ہے۔

قریب نو مضامین ہیں جن کا تعلق عہد وسطیٰ کے ہندوستان سے ہے۔ ان میں عہد سلطنت اور دور مغلیہ میں اوقاف کی اہمیت، عہد شاہجہانی میں ثقافت و معیشت جیسی بہت مفید اور معلومات افزا تحریریں ہیں۔ شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ اور داتا گنج بخشؒ کے تعلق سے علوم اسلامی اور مسئلہ سماع کے تعلق سے مضامین کو کسی درجہ عہد وسطیٰ کی تہذیبی تاریخ سے جوڑا جاسکتا ہے۔ لیکن علامہ شبلی، جامعہ اسلامیہ، لالہ لاجپت رائے، رام پور، علی گڑھ، دہلی اردو اخبار جیسے مضامین کے لیے عہد وسطیٰ کے ہندوستان سے رشتہ کا جواز تلاش کرنا کار دشوار ہے۔ اسی طرح عرب اور فارسی تاریخ نگاری اور امام جعفر صادقؒ کی فقہی بصیرت جیسے مقالات، کتاب کے نام کی وجہ سے اجنبی سے لگتے ہیں۔ لائق مصنف نے اپنے طویل مقدمے میں بھی اس کی جانب اشارہ نہیں کیا۔ ترتیب فہمی سے صرف نظر کرلیا جائے تو یہ کہنے میں مبالغہ نہیں کہ ہر مضمون بڑی محنت اور تحقیق و جستجو کی وجہ سے بار بار پڑھنے کے لائق ہے۔ عرب تاریخ نگاری ہو یا فارسی تاریخ نگاری، بہت کم تحریریں ایسی ہیں جن میں اس درجہ شرح و بسط سے عہد بعہد تاریخ نویسی کی ابتدا اور ارتقا اور اثرات و تغیرات زمانہ پر نظر کی گئی ہو اور اس نکتہ پر توجہ مرکوز کی گئی ہو کہ عرب تاریخ نگاری کی اساس قرآن مجید ہے۔ فارسی تاریخ نگاری

میں سفرناموں کی اہمیت کی جانب اشارہ مطالعہ کی صحت کی دلیل ہے۔

عہد سلطنت میں اوقاف کے متعلق دستاویزی بیانات میں عین الملک ماہرو کے حوالوں کو بنیاد بنایا گیا۔ اس سلسلے میں نیشنل آرکائیوز آف انڈیا کی چند دستاویزی معلومات نے اس مضمون کو وقعت بخش دی۔ سولہویں سترہویں صدی میں مالوہ کے ایک زمیندار خاندان کمبھ راج کو مغل حکمرانوں نے جس طرح جرائم کے سدباب کے لیے اختیارات دیے کاش اس کا مطالعہ آج کے اندھ راج کی آنکھ کھول سکتا۔ ہمارے لیے خاص دلچسپی کا سامان علامہ شبلی اور شبلی منزل کے حوالے سے ان دو مضامین میں ہے جن کے عنوانات ہیں 'مخطوطہ موازنہ انیس و دبیر پر ایک نظر' اور 'علامہ شبلی، شبلی منزل اور نیشنل آرکائیوز آف انڈیا'۔ موازنہ انیس و دبیر کے اس مخطوطے کا علم شاید بہتوں کے لیے پہلی بار اسی مضمون سے ہو۔ علامہ شبلی کے قلم سے اس کی تاریخ تکمیل اکتوبر ۱۹۰۳ء دی گئی ہے۔ فاضل مضمون نگار نے مطبوعہ اور مخطوطہ نسخوں کے فرق کا جائزہ لے کر بتایا ہے کہ دونوں میں ترتیب کا فرق ہے۔ علامہ شبلی کی ایک یادداشت مخطوطہ میں ہے اور بقول مصنف نہایت دلچسپ ہے۔ لیکن یہ مطبوعہ کتاب میں نہیں ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ مطبوعہ کے مرتب کے پیش نظر شاید کوئی اور نسخہ تھا ورنہ اس قدر تضاد ممکن نہیں۔ اس مضمون سے یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اچھا ہو جو مخطوطہ بھی مطبوعہ ہو جائے۔ اسی طرح، علامہ شبلی، شبلی منزل والے مضمون میں بتایا گیا کہ علامہ اور مولانا فراہی کے تعلق سے متعدد فائلیں اور خطوط، آرکائیوز میں موجود ہیں۔ اس میں شمس العلماء کے نقرئی بیج کے گم ہونے اور اس کی جگہ دوسرے بیج کی تیاری کا معاملہ واقعی دلچسپ ہے۔ اسی طرح ۱۹۲۳ء کی ایک رازدارانہ فائل ہے جس میں شبلی منزل کی سیاسی سرگرمیوں کو مشتبہ بتایا گیا۔ اس لیے انگریز صاحبان اقتدار و اختیار میں بعض نے حیدرآباد اور بھوپال سے ملنے والی معاشی مدد روک دیے جانے کی وکالت کی۔ اس رپورٹ میں لکھا گیا کہ دارالمصنفین حکومت مخالف سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ اس مضمون کے مشمولات سے شاید اس درجہ واقفیت پہلے کسی کو نہیں تھی۔ کتاب میں بعض دستاویزوں کی عکسی تصویریں بھی ہیں۔ اچھا ہوتا کہ ذیل میں ان کا تعارف بھی آجاتا۔ کمپوزنگ بہت اچھی ہے لیکن ایک جگہ قدرے مشترک شاید قدر مشترک کی بسیط شکل ہو گیا۔ کتاب کی محنت، نافعیت اور بعض مقامات پر جدت بجا طور پر اس کے مطالعہ کی دعوت دیتی ہے۔ (ع۔ص)

مولانا ابرار احمد فلاحی، قاری محمد قربانؒ حیات و خدمات: عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات:۷۶، قیمت: ۱۵۰/روپے، سال اشاعت:۲۰۲۳ء، پتہ کارسی ساتھ گھوسی، ضلع مئو،۲۷۵۱۰۵، اور البدر بک سینٹر، سرائے میر، اعظم گڑھ

بظاہر ایک گم نام انسان کے حالات کے لیے اس کی عمر کے عدد کے لحاظ سے صفحات کی تعداد ہو تو اس کے شکوے کی ضرورت نہیں۔ لیکن بعض زندگیاں بے نام، بے مقام، بے کلام ہونے کے باوجود عوام ہی نہیں، خواص کے دل میں اپنا احترام پیدا کر لیتی ہیں۔ ایسے لوگ دنیا سے تو بے نیازانہ گزر جاتے ہیں لیکن اپنے پیچھے نیاز مندوں کی ایک جماعت چھوڑ جاتے ہیں اور پھر ان کے تاثرات سے ایک خلقت کو محرومی اور بہت کچھ کھو دینے کا احساس یاد دلاتا ہے کہ ایک شخص کس طرح سارے شہر کو ویران کر گیا۔

قاری ظفر الاسلام، مولانا عمر اسلم اصلاحی، مولانا نسیم ظہیر اصلاحی، مولانا نعیم الدین اصلاحی، مولانا طاہر مدنی، تابش مہدی، مفتی ولی اللہ مجیدی، مولانا عتیق الرحمٰن اصلاحی، ڈاکٹر سکندر علی اصلاحی، ڈاکٹر عمیر منظر جیسے نامور عالموں، ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ابوالبرکات اصلاحی، اسامہ رشادی وغیرہ جیسے نوجوان نسل کے نمائندوں کے تاثرات اگر ایک جگہ جمع ہو جائیں تو پھر شخصیت کے نقوش واقعی یاد رکھے جانے والے مرقع میں بدل جاتے ہیں۔ شخصیت روشنی کا وہ مینار بن جاتی ہے جو تنہا سینکڑوں قمقموں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ اور بتاتی ہے کہ اخلاص عمل، شہرت سے زیادہ مقبولیت کا سبب ثابت ہوتا ہے۔ قاری قربان مرحوم کے اوصاف میں بتایا گیا کہ قرآن کریم کی تعلیم و تعلمان کی سب سے بڑی خوبی تھی، قاری ہونے کی شناخت اسی خصوصیت کی علامت ہے۔ نوہ کئی مدرسوں خصوصاً اصلاح و فلاح سے وابستہ رہے، ان کے مالی وانتظامی اور تدریسی معاملات میں قاری صاحب کی محنت سب سے زیادہ رہی، لیکن اسی درجہ زندگی، اخفائے حال کی مثال بھی بنتی رہی۔ شاید اس کی وجہ قرآن مجید سے تعلق اور خاص نسبت تھی، اس لیے یہ تعبیر کہ وہ 'قرآن پر قربان' تھے صرف صنعت لفظی نہیں، حقیقت بیانی ہے۔ قرآن مجید اور قرآنی علوم مجیدہ کے جذبۂ فروغ سے روشن احوال، مختصر ہی کیوں نہ ہوں، تاثیر میں کم نہیں ہوتے۔ (ع۔ص)

مولانا منور سلطان ندوی(مرتب)، عوامی مقامات پر نماز کا مسئلہ (مجموعہ مقالات فقہی

سیمینار ۲۰۲۳ء)، کاغذ وطباعت عمدہ، غیر مجلد، صفحات ۳۶۶، ملنے کا پتہ: مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء لکھنؤ، سن اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت وموبائل نمبر، درج نہیں۔ ای۔میل:
shariahacademynadwa@gmail.com

آنحضورؐ نے سات مقامات پر نماز پڑھنے سے بہ صراحت منع فرمایاہے۔ کوڑا ڈالنے کی جگہ، مذبح، قبرستان، راستے کے بیچ میں، غسل خانہ، اونٹ کے بیٹھنے کی جگہ اور کعبہ کی چھت پر۔ بعض فقہانے اس فہرست کو اشتراک علت کی بنیاد پر مزید طویل کیاہے لیکن اس میں عام مقامات، ارض غیر، ارض مغصوبہ یا پھر حکومت کی مملوکہ زمین کے متعلق کوئی واضح ہدایت نہیں ہے۔ البتہ اگر ان نشان زد چند مقامات پر غور کریں تو اس سلسلے میں بعد میں پیدا شدہ مسائل کا حل اور اس سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ چند سال پہلے تک مسلمانوں کو عام مقامات، پارکوں، ریلوے اسٹیشنوں حتیٰ کہ ریلوں اور طیاروں میں بھی نماز کی ادائیگی میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی مگر اب ایسا کرنے پر جیل ہوجاتی ہے اور اب تو ایسی خبریں بھی مل رہی ہیں کہ اپنے گھر میں بھی باجماعت نماز ادا کرنے پر کارروائی کی گئی ہے۔ چنانچہ اس مسئلے کی شرعی حیثیت ونوعیت پر غور وفکر ضروری خیال کیا گیا اور مجلس تحقیقات شرعیہ، لکھنؤ نے خاص اس مسئلے کو سیمینار کا موضوع بنایا۔ سوالات قائم کر کے مفتیان وعلمائے کرام کی خدمت میں بھیجا۔ ان سے جواب منگائے۔ زیر تبصرہ کتاب اسی سیمینار میں پیش کیے گئے مقالات اور اصحاب افتا کے جوابات کا مجموعہ ہے۔ کتاب میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ یہ مسئلہ مختلف پہلوؤں کا حامل ہے۔ تمام جہتوں سے جائزہ لینے اور تبادلۂ خیالات کے بعد قابل عمل تجاویز مرتب کی جائیں گی اور اس سلسلے میں نمازیوں پر جو زیادتیاں ہو رہی ہیں ان کی جانب حکومت کو بھی توجہ دلائی جائے گی۔ (ص ۲۸)

مرتب نے حاصل شدہ مقالات وجوابات کو چار ابواب میں منقسم کر کے سلیقے سے پیش کیا ہے۔ پہلا باب صدارتی خطبات اور تاثرات پر مشتمل ہے۔ دوسرے میں سوالنامہ اور تجاویز کے ساتھ بعض مقالات کی تلخیص اور عرض مسئلہ کے عنوان سے مولانا بدر احمد مجیبی ندوی کی ایک تحریر ہے۔ تیسرے باب میں عوامی مقامات پر نماز کا مسئلہ کے عنوان سے ہندوستان کے کل ۳۱ ندوی اور قاسمی فضلاء کے مقالات اور ان کے آراء شامل ہیں۔ چوتھے باب میں بعض علما کا مناقشہ اور سہ روزہ سیمینار کی مفصل رپورٹ ہے۔ اکثر علمانے ارض غیر، ارض مغصوبہ اور حکومت کے زیر ملکیت

زمین میں فرق کرکے ان مقامات پر نماز ہونے، نہ ہونے کے متعلق مستند فقہی معلومات فراہم کی ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ ان جگہوں پر عام حالات میں نماز پڑھنا مکروہ ہے (ص ۱۳۳)۔ ارض غیر میں صاحب زمین سے اگر اجازت نہیں لی گئی ہے تو نماز مکروہ ہوگی۔ ارض مغصوبہ کے باب میں جمہور کا بھی یہی فیصلہ نقل کیا گیا ہے اور لکھا گیا ہے کہ سرکاری زمین میں نماز ادا کرنے سے بچنا چاہئے (ص ۱۸۸) عوامی مقامات پر جہاں حکومت کی طرف سے پابندی لگائی جارہی ہو یا نماز پڑھنے سے فتنے کا خوف ہو تو احتیاط کی جائے (ص ۱۰۵)۔ کلیدی خطبہ لائق مطالعہ اور اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں اجتماعی یا شورائی اجتہاد کی مثالیں عہد صحابہ سے پیش کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ تحقیقات شرعیہ کے قیام اور اس کی سرگرمیوں کی مختصر مگر جامع تاریخ بھی آگئی ہے۔ بایں طور اس مجموعہ کی نافعیت اور دستاویزی حیثیت میں کوئی شک نہیں۔ (کلیم صفات اصلاحی)

مولانا محمد نصر اللہ ندوی (مرتب)، مساجد میں خواتین کی آمد شرعی احکام و مسائل (مجموعہ مقالات فقہی سیمینار ۲۰۲۳ء)، کاغذ و طباعت عمدہ، غیر مجلد، صفحات ۳۶۸، ملنے کا پتہ: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ندوۃ العلماء لکھنؤ، سن اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت و موبائل نمبر، درج نہیں۔ ای۔میل: shariahacademynadwa@gmail.com

اسلامی نظام حیات میں مسجدوں کی بڑی اہمیت ہے۔ عہد نبوی اور اس کے بعد کے ادوار میں تمام تر دینی، دعوتی، تعلیمی و تربیتی سرگرمیوں کا مرکز مسجدیں تھیں۔ آنحضورؐ اور عہد صحابہ میں مسجدوں میں صحابیات و تابعات کی جماعت میں شمولیت ممنوع نہیں تھی۔ بعض ایسی روایتیں بھی ہیں جن سے مشروط اجازت کا علم ہوتا ہے۔ البتہ بعض فقہاء مکروہ تحریمی یا تنزیہی قرار دیتے ہیں لیکن اکثریت جواز کی قائل ہے مگر معقول و مخصوص انتظام نہ ہونے کے سبب باقاعدہ پنج وقتہ نمازوں میں ان کی شرکت کو فتنے کے ڈر سے نامناسب بھی خیال کرتی ہے۔ ایسا اس لیے بھی ہے کہ شریعت میں خواتین کا مسجد کے بجائے گھر میں نماز ادا کرنا افضل بتایا گیا ہے۔ اس احتیاط پر امت کے عمل سے یہ سمجھ لیا گیا کہ اسلام عورتوں کی حق تلفی کرتا ہے اور انہیں مسجد جیسی مقدس جگہ جانے سے بالکلیہ روکتا ہے، جب کہ ایسا نہیں ہے۔ کچھ عرصہ قبل پونہ میں ایک عورت نے سپریم کورٹ میں کیس دائر کیا کہ مسجد میں جانے کی ہم پر پابندی ہے اور صنفی بنیاد پر ہمارے ساتھ تفریق کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ

اور بھی خواتین مسجد میں نماز ادا کرنے کی اجازت مانگنے لگیں۔ چنانچہ تحقیقات شرعیہ نے اس اہم موضوع پر سیمینار کی ضرورت محسوس کی تاکہ کتاب وسنت کی روشنی میں اصل مسئلے کا جائزہ لیا جائے اوراس سلسلے میں اٹھنے والے سوالات کے تسلی بخش جوابات بھی سامنے آجائیں۔ زیر نظر کتاب اسی سیمینار میں پیش کیے گئے مقالات، فتاوی، مناقشات اور منظور شدہ تجاویز کا مجموعہ ہے۔

اکثر مقالات میں احادیث مبارکہ، صحابہ کے آثار اور تابعین کی روایات سے یہ استنباط کیا گیا ہے کہ عہد نبوی میں عورتوں کے مسجد میں جانے اور باقاعدہ نماز ادا کرنے کی مشروط اجازت تھی اور انہیں روکا نہیں جاتا تھا۔ البتہ آپؐ کے وصال کے بعد حضرت عمرؓ، حضرت عائشہؓ اور بعض دیگر صحابہ نے شرائط کی خلاف ورزی دیکھی تو ممانعت کر دی اور ان کے علاوہ کئی اور صحابہ نے بھی مہر تصدیق ثبت کر دی۔ ان کے بعد بعض محتاط فقہانے بھی اسی پر عمل کیا لیکن واضح رہے کہ صحابہ کا یہ فیصلۂ ممانعت، نسخ حکم نہیں تطبیق حکم تھا۔ اس لیے کہ عہد نبویؐ میں جن مواقع کے لیے حکم دیا گیا تھا رفتہ رفتہ وہ معدوم ہو گئے تو صحابہ کرام نے حالات کے تناظر میں شریعت کے دو احکام میں سے ایک حکم کی تطبیق کی ہے۔ نعوذ باللہ نسخ حکم کا ارتکاب نہیں کیا ہے۔ (ص ۴۵۔۵۵)

بحث کے دوران اکثر مقالہ نگاروں نے اس مسئلہ کے قابل لحاظ پہلوؤں پر غور وخوض کر کے معتدل، متوازن اور لائق عمل رائے دی ہے۔ یعنی اسلام میں ممانعت نہیں ہے۔ صرف پنج وقتہ نمازوں میں بالالتزام ان کی شرکت کو احتیاطی تدبیر کے طور پر غیر موزوں خیال کیا گیا ہے۔ ص ۱۵۰ پر ہے کہ موجودہ دور میں مناسب موقف وہی ہے جو چلا آرہا ہے کہ مساجد میں خواتین کو آنے سے نہ روکا جائے اور نہ ہی ترغیب دی جائے۔ ص ۱۶۰ پر ہے کہ موجودہ دور میں جب کہ بے حیائی اور فتنہ وفساد عام ہے خواتین اسلام کو جمعہ اور باجماعت نماز کے لیے گھروں سے نکلنے کی اجازت نہ دینے ہی میں خیر و بھلائی ہے۔ حالانکہ مناقشے میں اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے شد ومد سے یہ کہا گیا ہے کہ فتنے کا اندیشہ ہر زمانے میں تھا، جتنا فتنے کا اندیشہ آج ہے، اتنا ہی متقدمین فقہائے احناف، متاخرین اور عہد نبویؐ میں تھا۔ اس کے باوجود اللہ کے رسولؐ نے ممانعت نہیں کی (ص ۳۵۵)۔ ایک مقالہ نگار کی یہ رائے قابل ذکر ہے کہ احادیث میں جو الفاظ وارد ہیں کہ منع نہ کریں، جو عورتیں اجازت طلب کریں ان کو اجازت دی جائے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ عہد نبویؐ

میں بھی خواتین کے مسجد میں آنے کا عمومی ماحول نہیں تھا(ص ۳۶۳)۔ خود علامہ ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ جماعت اور جمعہ کی نماز میں خواتین آتی تھیں، عمومی ماحول نہیں تھا، اس لیے کہ رسول اللہؐ کے دوسرے فرمان کے مطابق گھروں میں ان کا نماز پڑھنا بہتر ہے۔

یہ مجموعۂ مقالات اپنے موضوع پر بھرپور ہے۔ قدیم وجدید آراونظریات پر مبسوط و مفصل معلومات اور دلچسپ سوالات کے تشفی بخش جوابات فراہم کرتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ عام وخاص دونوں قسم کے قارئین کے لیے بہت مفید ہے۔ (ک۔ص اصلاحی)

جواہر القرآن حصہ اول(پارہ ۱-۵) تفسیر وتشریح مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ، ترتیب وتحقیق مفتی محمد صادق مبارک پوری، ناشر: مولانا قاضی اطہر اکیڈمی مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ، یوپی، ۲۰۲۳ء، صفحات ۵۹۲۔

قاضی اطہر مبارکپوریؒ ایک بلند پایہ محقق اور عظیم مورخ اسلام کی حیثیت سے معروف ہیں۔ انہوں نے اسلامی تاریخ پر گہری نظر کے ساتھ قرآن وحدیث، تفسیر، فقہ، صحافت وشاعری میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ وہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کے اعزازی رفیق اور اس کی کمیٹی کے ممبر تھے۔ ان کا اعتراف ہے کہ مجھے دارالمصنفین کی تصنیفات اور رسالہ معارف سے بڑا فائدہ ملا، اور میرے تصنیفی ذوق کو اس سے بڑی مدد ملی۔[1]

زیر تبصرہ کتاب روزنامہ انقلاب ممبئی میں 'معارف القرآن' کے کالم کا مجموعہ ہے، جو چالیس برس تک برابر شائع ہوتا رہا ہے۔ قاضی صاحبؒ نے اس کالم کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ میں نہایت صفائی سے عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ معارف القرآن(جواہر القرآن) میں جو کچھ ہے، وہ نہ تفسیر ہے، نہ تاویل ہے، بلکہ قرآن حکیم کی آیات کو سامنے رکھ کر ایک تحریر ہے، جو ہندوستان کے مسلمانوں پر موجودہ حالات کے پیش نظر تیار کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں کہیں کسی قسم کی نہ دقت ہے اور نہ وہ باتیں ہیں، جو تفسیر کی کتابوں میں ہوتی ہیں (جواہر القرآن، ص: ۳۵-۳۶)

اب چند نمونے اس کتاب کے پیش کیے جاتے ہیں، تاکہ اس کی معنویت سے قارئین واقف

---

[1] ماہنامہ معارف اگست ۱۹۹۶ء، ص ۱۴۴

ہوسکیں:

يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُواْ نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَوْفُواْ بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ (البقرۃ:۴۰) (اے بنی اسرائیل! تم لوگ میری اس نعمت کو یاد کرو، جسے میں تم کو دیا ہے اور تم میرے وعدے کو پورا کرو، میں تمہارے وعدے کو پورا کروں گا، اور صرف مجھ سے ہی ڈرو)

اس کی تفسیر کرتے ہوئے قاضی صاحبؒ نے لکھا ہے کہ یہاں پر قوم یہود سے فرمایا جارہا ہے کہ اے بنی اسرائیل کے لوگو! ہم نے تم کو جو طرح طرح کی دنیاوی اور دینی نعمتیں دی ہیں، تو اس وعدہ پر کہ تم دنیا میں ایمان ودیانت کا کام کروگے اور میں تم کو اس کی برکت سے دنیا اور آخرت کا اعزاز بخشوں گا، پس اے بنی اسرائیل !اگر تم اپنی راہ چل رہے ہو تو پھر میرا وعدہ بھی تمہارے ساتھ ساتھ چل رہا ہے اور تم بے راہ ہو تو پھر خدائی وعدۂ نعمت کو کوئی ضرورت نہیں پڑی ہے کہ وہ تمہارے حق میں خواہ مخواہ وہ وفادار ہوتا رہے (ص: ۵۳)۔

ایسے ہی ایک دوسری آیت ملاحظہ ہو: وَلَن تَرْضَى عَنكَ الْيَهُودُ وَلاَ النَّصَارَى حَتَّى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ إِنَّ هُدَى اللّهِ هُوَ الْهُدَى (البقرۃ:۱۲۰) (اور آپ سے ہرگز ہرگز یہود ونصاریٰ راضی نہ ہوں گے، جب تک آپ ان کے طریقہ پر نہ چلنے لگیں گے۔ آپ کہہ دیں کہ اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے)۔

اس کی تشریح وتفسیر کرتے ہوئے قاضی صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اس دنیا میں یہود ونصاریٰ یہ دونوں قومیں مسلمانوں کی حاسد اور دشمن ہیں اور ایک نظر بھی مسلمانوں کو پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتی ہیں اور یہ ہمیشہ اس کوشش میں رہتی ہیں کہ مسلمان اپنے تمام خصائص وامتیازات سے دست بردار ہوکر ان کی راہ پر چلنے لگیں، ان کے افکار وخیالات کو اپنائیں، ان کی تہذیب اختیار کریں، ان کی ثقافت پر چلیں اور اپنی وضع قطع سے منحرف ہوجائیں۔ ان دونوں اور ان جیسی دوسری قوموں سے مسلمانوں کو صاف صاف کہہ دینا چاہیے کہ ہم اللہ کی ہدایت یعنی اسلام پر کاربند ہیں (ص: ۷۷-۷۸)۔

مذکورہ چند نمونے سے اس کتاب کی اہمیت کو سمجھا جاسکتا ہے کہ قاضی صاحب نے منتخب آیات کا انتخاب کرکے عصری اسلوب میں ان کی دل نشین تشریح کی ہے۔ مجموعی لحاظ سے کتاب لائق مطالعہ ہے۔

(فضل الرحمن اصلاحی)

ادبیات

بیاد مدینہ

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی
نعمانی منزل، نزد ابوہریرہ مسجد، ہمدرد نگر، جمال پور۔ علی گڈھ
ar.arshadnomani@gmail.com

مری جاں مدینہ مرا دل مدینہ — مری سب مرادوں کا حاصل مدینہ
تلاطم ہو کیسا ہی بحرِ جہاں میں — مری کشتیوں کا ہے ساحل مدینہ
نگاہِ محبت کا ہے فیصلہ یہ — ہے خلدِ بریں کے مماثل مدینہ
جو پوچھو زمیں پر بھی ہے کوئی جنت — کہیں گے یہی سارے عاقل مدینہ
خدا کا ملے قرب، اپنا کے جن کو — سکھاتا ہے ایسے مشاغل مدینہ
پرکھتا ہے انساں کے فکر و عمل کو — جدا کرتا ہے حق سے باطل مدینہ
رہِ زندگانی میں جنّ و بشر کا — منارِ مسیرِ منازل مدینہ
غلاموں، اسیروں، ضعیفوں کے حق میں — ہے آئینِ قطعِ سلاسل مدینہ
ہزاروں صحابہؓ کے مدفن یہاں ہیں — ستاروں کی ہے ایک محفل مدینہ
بہت شہر ہیں یوں تو روئے زمیں پر — مگر جاکے بسنے کے قابل مدینہ
ہے سچ یہ کہ وہ اک الگ ہی جہاں ہے — جہاں میں اگرچہ ہے شامل مدینہ
جو کچھ مانگنا ہے وہ مانگو خدا سے — خدا ہی کا ہے خود بھی سائل مدینہ
وہ آقاؐ کی مسجد وہ آقاؐ کا روضہ — وہ محبوبِ عالی و سافل مدینہ
عجب شانِ دیدار تھی اللہ اللہ! — نظر کی جگہ دل تھا اور دل مدینہ
وہی آٹھ دن حاصلِ زندگی تھے — نگاہوں کے تھا جب مقابل مدینہ

رئیس آہ کیوں لوٹ آئے وہاں سے
حقیقت میں تھی اپنی منزل مدینہ

رسید کتب موصولہ

ڈاکٹر محمود حافظ عبد الرب مرزا، آیئے عربی بول چال سیکھیں: مکتبہ نعیمیہ، مئو، صفحات: ۱۷۱، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۲۲۰روپے، موبائل نمبر: ۹۴۵۰۷۵۵۸۲۰

ڈاکٹر محمد فرمان ندوی، الشیخ سعید الاعظمی الندوی: حیاتہ وآثارہ (عربی): مکتبہ احسان، مکارم نگر، لکھنؤ، صفحات: ۵۴۸، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۵۰۰روپے، موبائل نمبر: درج نہیں

مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی، محمد امین حسنی ندوی (مرتب)، دعوتِ فکر و نظر: مجلسِ تحقیقات ونشریاتِ اسلام، لکھنؤ، صفحات: ۲۵۶، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۲۵۰روپے، موبائل نمبر: ۹۴۵۲۲۹۴۰۹۷

مولانا محمد علاء الدین ندوی، روعۃ البیان عن طریق الحوار (عربی): حرا بک ڈپو، ٹیگور مارگ، ڈالی گنج، لکھنؤ، صفحات: ۱۷۶، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۳۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۸۲۱۴۲۴۱۴۷

ڈاکٹر شکیل احمد، سفر یاری (سفرنامہ): پاریکھ بک ڈپو، لکھنؤ، صفحات: ۱۲۸، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۲۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۳۸۹۴۵۶۷۸۶

مولانا اشہد رفیق ندوی، محمد طارق بدایونی (مرتب)، قرآنی مباحث: تفہیم و تجزیہ: ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی، نبی نگر، دوہرّا، علی گڑھ، صفحات: ۳۱۸، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۳۵۰روپے، ای میل: idaratahqeeq2016@gmail.com

ڈاکٹر شکیل احمد، گرم دمِ جستجو (خاکے): بک امپوریم، پٹنہ، صفحات: ۲۲۴، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۳۵۰روپے، موبائل نمبر: ۹۲۳۶۷۲۲۵۷۰

مولانا محمد عرفات اعجاز اعظمی، مشاہیر علم و ادب کا گورکھپور سے ربط و تعلق: ساجد علی میموریل کمیٹی، گورکھپور، صفحات: ۲۱۶، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۲۵۰روپے، موبائل نمبر: ۹۹۳۶۰۲۹۴۶۳

مولانا رحمت اللہ ندوی (مرتب)، نصاب زکوٰۃ کا معیار اور ضم نصاب: مکتبہ احسان، نزد شباب مارکیٹ، ندوہ روڈ، لکھنؤ، صفحات: ۳۹۲، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: درج نہیں، ای میل: shariahacademynadwa@gmail.com

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، نقش و اثر: البلاغ پبلی کیشنز، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی، صفحات: ۲۰۸، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۳۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۹۷۱۴۷۷۶۶۴

تصانیف سید صباح الدین عبدالرحمٰنؒ

اسمائے کتب	قیمت	اسمائے کتب	قیمت
حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ	20/-	ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں	60/-
حضرت ابوالحسن ہجویری	20/-	ظہیر الدین محمد بابر (ہندو مورخین کی نظر میں)	300/-
مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر	70/-	ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (اول)	150/-
محمد علی کی یاد میں	250/-	ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (دوم)	100/-
بزم رفتگاں اول	240/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
بزم رفتگاں دوم	250/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (اول)	75/-
صوفی امیر خسرو	150/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
اسلام میں مذہبی رواداری	250/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (دوم)	100/-
بزم تیموریہ اول	400/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
بزم تیموریہ دوم	220/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (سوم)	150/-
بزم تیموریہ سوم	260/-	مغل بادشاہوں کے عہد میں ہندوستان	
بزم صوفیہ	350/-	سے محبت وشیفتگی کے جذبات	150/-
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک	240/-	مقالات سلیمان (اول)	400/-
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام	425/-	غالب مدح وقدح کی روشنی میں (اول)	350/-
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے	250/-	غالب مدح وقدح کی روشنی میں (دوم)	150/-
بزم مملوکیہ	250/-	سید سلیمان ندوی کی دینی وعلمی خدمات پر ایک نظر	60/-
ہندوستان کے سلاطین علما اور مشائخ پر ایک نظر	250/-	مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف کا مطالعہ	150/-
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے		عالم گیر (انگریزی)	100/-
تمدنی کارنامے	200/-	صلیبی جنگ	25/-

AUG 2025 Vol- 212(08) ISSN 0974-7346 Ma'arif(Urdu)-Print

RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP- 43/2023-25

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)
Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی چند اہم کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
مطالعات شبلی	پروفیسر اشتیاق احمد ظلی	550/-
حیات سعدی	خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
شبلی شناسی کے اولین نقوش	پروفیسر ظفر احمد صدیقی	600/-
امام رازی	مولانا عبدالسلام ندوی	320/-
شبلی کی آپ بیتی	ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
تاریخ اسلام (اول ودوم اور سوم وچہارم)	شاہ معین الدین احمد ندوی	1060/-
تاریخ صقلیہ (اول ودوم)	مولانا سید ریاست علی ندوی	800/-
مطالعۂ مذاہب کی اسلامی روایت	پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی	300/-
مختصر تاریخ ہند	مولانا ابوظفر ندوی	80/-
ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں	مولانا ابوالحسنات ندوی	80/-
مرزا دبیر کی شاعری	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	150/-
تعلیم - عہد اسلامی کے ہندوستان میں	پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی	100/-
عہد اورنگ زیب میں علماء کی خدمات	ڈاکٹر علاء الدین خاں	380/-
آثار شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	500/-
شبلی کی ادبی وفکری جہات	ڈاکٹر شمس بدایونی	200/-

دارالمصنّفین کی نئی مطبوعات

کتاب	مصنف	قیمت
روایاتِ سیرت نبویؐ (بلاذری کے حوالے سے)	مولانا کلیم صفات اصلاحی	450/-
مصادرِ سیرت نبویؐ (مجموعۂ مقالات سیمینار)	مرتبہ: مولانا کلیم صفات اصلاحی	600/-
عہد اسلامی کا ہندوستان: معاشرت، معیشت اور حکومت کے مسائل	پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی	300/-
وفیات مشاہیر (مولانا ضیاء الدین اصلاحی)	ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں وسلیم جاوید	600/-
دارالمصنّفین کے سوسال (اضافہ شدہ)	مولانا کلیم صفات اصلاحی	500/-